الایام: مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ و ثقافت، کراچی جلد: ۱، شمارہ: ۲، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۰

روس میں پان ترکزم اور اسلام

تلخیص و ترجمہ

PAN-TURKSIM & ISLAM IN RUSSIA کے عنوان سے ایک کتاب ہارورڈ یونی ورسٹی (امریکہ) کے روسی ریسرچ سینٹر کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے مصنف سر جے۔اے ،زنکووسکی ہیں۔ روس کے مسلمان ترکوں کی ۱۹۲۰ء تک کی علمی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں پر اس میں بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تلخیص و ترجمہ ''الرحیم'' (حیدرآباد) میں قسط وار اگست ۱۹۶۴ء تا جنوری ۱۹۶۵ء، چھ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ وسط ایشیا اور روسی مسلمانوں کے حوالے سے چونکہ اردو میں مواد بہت کم ہے، لہذا افادہ عام کے لیے اس تلخیص و ترجمہ کو ''بازیافت'' کے تحت شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیرہ)

مصنف دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۰۵ سے لے کر ۱۹۲۰ء تک جب کہ زاروں کا دوراقتدار ختم ہوگیا، روسی سلطنت میں بسنے والی مختلف اقوام کو اپنی قومی آرزوں کے کھلے بندوں اظہار کا اس عہد جدید میں سب سے زیادہ موقع ملا تھا۔ انہی اقوام میں سے روسی ترک بھی تھے ،جن کی غالب اکثریت مسلمان ہے، اور سلاوی نسل کے بعد وہ زاروں کے روس اور آج کے سویت روس میں سب سے بڑی قوت ہیں۔ یہ ترک قومیں اسلامی دنیا کا ایک اچھا خاصا حصہ ہیں اور اگر ایک طرف ان ترکوں کی اقتصادی اور ثقافتی سرگرمیوں اور ان کی عدوی طاقت نے مشرق کے متعلق روس کے طرز عمل کو متاثر کیا ہے، تو دوسری طرف ان کا جو جغرافیائی محل وقوع ہے، اس کی بناء پر وہ ایشیا میں روسی پالیسیوں کے لیے ایک دکھانے کی

چیز بن گئے ہیں۔ مصنف کے الفاظ میں ''اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصے میں آج جوش وخروش پایا جاتا ہے، اس کی وجہ سے ان قوموں کی تاریخ سے اس وقت اور بھی زیادہ دلچسپی لی جانے لگی ہے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک مسلمان قومیں آج ایک اضطراب میں مبتلا ہیں، اس لیے ان کے ایک حصے کے متعلق، جسے سب سے پہلے جدید انقلاب کے مراحل سے گزرنا اور اس کے اثرات سے دوچار ہونا پڑا ہے، بہتر معلومات شاید پوری اسلامی دنیا کو سمجھنے کے لیے ایک کڑی کا کام دے سکیں۔''

کل ترک اقوام کی مجموعی تعداد اس وقت کوئی پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ ان میں سے دو کروڑ ترکی میں ہیں، اور اتنے ہی سوویت یونین میں، اور باقی چینی ترکستان صوبہ سنکیانگ شمالی افغانستان ایران اور بلقان کے ملکوں میں۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ترک اپنے اصلی مسکن التائی پہاڑوں اور منگولیا سے نکلے پھر گیارہویں صدی عیسوی میں وہ وسطِ ایشیا، ایران، اناطولیا اور جنوبی روس پر قابض ہوگئے، اور ایک وقت آیا کہ عثمانی ترکوں نے اپنی ایک زبردست سلطنت قائم کی وسط ایشیا یعنی بخارا تاشقند سے لے کر اناطولیہ اور استنبول تک کے اس وسیع علاقہ میں ترک اقوام کے پھیلنے اور مقامی لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے سے ان کی ایک زبان نہ رہی، پہلے مغرب میں عثمانی ترکوں کی زبان ترکی تھی اور ادھر مشرق میں وسط ایشیا کے علاقوں میں چغتائی، لیکن چغتائی زبان مرورایام سے مردہ ہوگئی، اور علاقائی بولیوں کی بنیاد پر نئی زبانیں وجود میں آئیں۔ جنہیں اب سوویت یونین نے قومی زبانوں کا درجہ دے دیا ہے۔

سوویت یونین میں ترکی کی بڑی بڑی آبادیاں یہ ہیں:۔ بحرہ اسود کے نواح میں کریمیا کے ترک، دریائے وولگا اور یورال کے علاقوں میں تاتاراور ان سے متصل بشکیری، مشرق میں قازق، پھر کرغیزی، اور ان سے متصل مغرب کی طرف سمرقند، بخارا، خیوا وغیرہ ہیں، جوازبک ہیں۔ انہیں کے ساتھ تاجک، آذربائیجان اور ترکمان ہیں۔

اب نسلی اور قومی اعتبار سے خواہ ان سب ترک اقوام کا مورث اعلیٰ ایک ہی ہو۔ لیکن صدیاں گزرنے کے بعد نہ تو ان میں قومی و علاقائی یک جہتی رہی تھی، اور نہ ان کی ایک زبان ہی تھی، چنانچہ جب انیسویں صدی عیسوی کے وسط اور اواخر میں روس کے ترکوں میں قومی بیداری کا آغاز ہوا، تو لامحالہ اس کی نوعیت اسلامی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ ایشیا اور مشرقی یورپ کے مسلمانوں نے نسل اور قومیت کے بجائے اپنے آپ کو اکثر مذہب اسلام اور اس کی ثقافت ہی سے وابستہ کیا ہے اور دوسرے خودزاروں کے روس میں بھی ترکوں کو غیر ترکوں سے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہی الگ سمجھا جاتا

تھا۔ اسی سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ روس کے تقریباً تمام مسلمان ترک ہیں، اور روس میں جو بھی ترک ہیں، ان میں سے نوے فیصد مسلمان ہیں، بہت کم غیر مسلم ترک تھے، جو بعد میں عیسائی ہوگئے۔ چنانچہ اس دور کے روس میں ترک اور مسلمان کا ہم معنی ہونا بالکل قرین قیاس تھا۔

غرض انیسویں صدی میں جب روس کے ترکوں میں بیداری شروع ہوئی، تو ان مین ترکیت کا لسانی، قومی اور نسلی شعور ان کی اسلامی ثقافتی وحدت کے احساس پر غالب نہیں آسکا اور یہ صورت حال اشتراکی انقلاب کے بعد ۱۹۲۰ء تک رہی۔ جب کہ ترک کمیونسٹ بھی اسلامی انقلاب اور اسلامی تعلیمی مسائل کی باتیں کرتے تھے۔ نماز میں ترکی زبان کو رائج کرنے کی روس میں سب سے پہلی کوشش انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ اور اسے دیندار علماء نے کھلا الحادقرار دیا ۱۹۰۸ء میں تاتاری علماء کی ایک جماعت نے روسی حکومت سے شکایت کی کہ ان کے بعض ''انقلابی'' افراد مسجدوں میں جمعہ کی نماز تاتاری زبان میں پڑھنے کی کوشش کررہے ہیں، اور یہ مذہب اسلام میں سخت ممنوع ہے۔ ۱۹۱۲ء میں کسی حد تک ایک ترقی پسند تاتاری عالم صدیق امان کولف نے ایک آزادی پسند (لبرل) اخبار میں لکھا کہ قرآن مجید کا تاتاری جیسی عامیانہ زبان میں ترجمہ کرنا ناممکن اور تقریباً کفر و الحاد ہے، چنانچہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ اسلامی اداروں تک میں قرآن مجید اور فقہ اسلامی کی تعلیم عربی زبان ہی میں دی جاتی رہی، اور اس کے لیے ترکی کو کبھی ذریعہ تعلیم نہیں بنایا گیا۔ نیز خود عربی زبان کی تعلیم فارسی میں لکھی ہوئی درسی کتابوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں وسط ایشیا اور بخارا میں جہاں ازبک آباد تھے، علمی و ادبی زبان فارسی تھی۔

روسی سلاویوں اور ترکوں کا ایک عرصہ دراز سے باہم ٹکراؤ رہا ہے۔ پہلے ترکوں کا پلہ بھاری تھا سترہویں صدی میں تاتاریوں نے کوئی دو لاکھ کے قریب روسی غلام کریمیا اور اناطولیہ کی منڈیوں میں بیچے تھے۔ اور تو اور اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک کریمیا کے تاتاریوں کے یوکرین پر حملے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ جب ۱۸۶۸ء میں روسی فوجیں بخارا میں داخل ہوئیں تو انہوں نے بہت سے روسی غلاموں کو آزاد کرایا تھا۔ لیکن پندرہویں صدی میں تاریخ کا رخ پلٹنا شروع ہوا۔ اور سلاوی بتدریج زور پکڑتے گئے۔ یہاں تک کہ زاروں کے عہد حکومت میں کریمیا سے لے کر قازقستان اور بخارا کے ترک علاقے روسی سلطنت کا حصہ بن گئے۔

وولگا اور یورال کے تاتاری علاقے کو روسیوں نے ۱۵۵۲ء میں فتح کیا، اس کے بعد وہاں روسی آباد کار آنے شروع ہوگئے، اور ساتھ ہی تاتاری مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں بھی کی جانے

لگیں، جب اس میں ناکامی ہوئی، تو ۱۵۵۶ء کی تاتاریوں کی بغاوت کے بعد ان میں سے جو عیسائی ہونے کو تیار نہ تھے، انہیں مرکزی شہر قازان میں رہنے سے روک دیا گیا اور چونکہ مسجدیں روسیت کو اپنانے اور عیسایت کی تبلیغ کی سرگرمیوں کے مخالف مرکز تھے، اس لیے تمام مسجدوں کو گرانے اور روسی حکومت کی اجازت کے بغیر کسی نئی مسجد کو تعمیر نہ کرنے کے احکام صادر کئے گئے۔ لیکن تاتاری اپنے اسلامی عقائد پر بالعموم ثابت قدم رہے، اور سوائے ان کے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے کوئی بھی عیسائی نہ ہوا۔ بہر حال عیسائی مشنریوں کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ اور طرح طرح کے حیلوں سے تاتاریوں کو عیسائی بنانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ صرف ۱۷۴۳ء میں کوئی پانچ سو کے قریب نئی اور پرانی مسجدیں گرادی گئیں۔ اندازہ یہ ہے کہ ۱۸۲۸ء میں کل جو تاتاری نئے عیسائی ہوئے تھے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی لیکن یہ سب کے سب بعد میں پھر مسلمان ہو گئے۔

مشنریوں کی یہ زیادتیاں آخر رنگ لائیں، ۱۷۵۵ء میں تاتاریوں نے پھر بغاوت کی جس میں مشنری بری طرح مارے گئے، صرف ایک صوبہ قازان میں کوئی ایک سو پچاس پادری قتل ہوئے، اس کے بعد روسی حکومت کو اپنی یہ پالیسی بدلنی پڑی۔ ملکہ کیتھرائن کے عہد میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی دی گئی۔ ۱۷۸۸ء میں ان کے لیے امور مذہبیہ کا ایک محکمہ قائم ہوا۔ جو مساجد کے نظم ونسق کا نگراں بھی تھا ۔ اور اسی کے زیر اہتمام ان کی مذہبی تعلیم کی بھی طرح پڑی اور اس طرح آگے چل کر روس میں تاتاری اسلامی ثقافت کی نشونما اور ترقی کے امکانات پیدا ہوئے ۔ مسلمانوں کے اس محکمہ امور مذہبیہ کا سربراہ ایک مفتی ہوتا تھا۔

تاتاریوں کی تسخیر کے بعد روسی وسط و شرق ایشیا کے ترک علاقوں کی طرف بڑھتے ہیں اور جہاں جہاں روسیوں کا قبضہ ہوتا ہے، وہاں وولگا اور یورال کے یہ تاتاری تاجروں کی حیثیت میں پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح تاتاریوں کا متوسط (بوژاوی) طبقہ وجود میں آتا ہے، بقول مصنف کے، یہ تاتاری تاجراس قابل ہوگئے کہ انہوں نے وولگا کی صنعتوں اور یورال کی کانوں میں اپنے کاروباری مفادات کو مضبوط کرلیا۔ چین اور منگولیا کے ساتھ ان کی تجارت بڑھ گئی اور سائبیریا کی منڈیوں میں سرمایہ لگانے میں وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔

انیسویں صدی میں تاتاریوں کی یہ بیداری صرف اقتصادی زندگی تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دائرہ اثر میں مذہب اور ثقافت بھی آگئے۔ ۱۷۸۸ء میں مذہبی آزادی کی پالیسی اور محکمہ امور مذہبیہ کے قیام کے بعد مذہبی تعلیم کی ترقی میں، جوائمہ، خطباء اور علماء کی تربیت اور امور

مذہبیہ کے عام نظم ونسق کو چلانے کے لیے ضروری تھی، بڑی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک تاتاری علاقے میں دینی درس گاہوں کا معیار کافی پست تھا، اس لیے قدرتاً تاتاریوں کی نظریں وسط ایشیا کے دینی مدارس کی طرف اٹھنے لگیں۔ بخارا کے دینی مدارس کی کوئی دسویں صدی عیسوی سے تمام مشرقی اسلامی دنیا میں بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ نوجوان تاتاری علوم دینیہ کی تکمیل کی غرض سے ان مدارس میں بھیجے جانے لگے، لیکن تاتاری طلبہ بہت جلد وسط ایشیا کے ان مدارس میں مروج جامد، اور پرانے طریقہ تعلیم سے بدول ہوگئے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں وولگا کا ایک مشہور تاتاری عالم دین عبدالناظہر (۱۷۷۵ء۔ ۱۸۱۳ء) بخاری علماء کے اس نظریہ طریقہ تعلیم کے خلاف احتجاج کرتا ہے، لیکن شہاب الدین مرجانی (۱۸۱۵ء۔ ۱۸۸۹ء) جو پہلا جدید تاتاری مورخ اور مصلح (ریفارمر) تھا اور تاتاری ثقافتی احیاء وبیداری کا آغاز کرنے والا ہے، وہ بارہ سال بخارا میں رہ کر ۱۸۴۹ء میں واپس وطن آیا۔ اور اس نے علاقہ وولگا میں اسلامی درس گاہوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ قرآن مجید اور علوم اسلامیہ حاصل کرنے کے پرانے جامد طریقے کے بجائے نسبتاً کم نظری اور زیادہ علمی طریقے کو رائج کیاجائے اور وہ اس پر بھی مصر تھا کہ ہر سچے ایماندار کو قران مجید خود سمجھنے کا حق ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ جدید علوم کی تعلیم اور روسی زبان کا حصول مذہب اسلام کے لیے نقصان دہ نہیں، بلکہ اس سے مسلمانوں کو اسلام کے سمجھنے اور اپنے ثقافتی معیار کو بلند کرنے میں مدد ملے گی۔ مرجانی محض ایک نظری آدمی تھا بلکہ وہ ایک علمی استاد بھی تھا۔ اس نے اپنے ان خیالات کو عملی شکل دی اور بہتر قسم کے دینی مدارس قائم کرنے کے لیے وہ مسلسل جدوجہد کرتا رہا۔ بیس سال کی کوششوں کے بعد وہ ایک صاحب ثروت قازانی تاجر کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوا کہ وہ ایک نئے مدرسے کے قیام میں مالی مدد دے۔ مرجانی نے وولگا کے بلغروں اور تاتاریوں کے متعلق کئی اہم کتابیں بھی لکھیں اور ۶۱ سال کی عمر میں وہ روسی حکام کے قائم کردہ قازان کے ایک سکول میں، جہاں استادوں کو ٹرینڈ کیا جاتا تھا، وہ استاد بھی ہوگیا۔

مرجانی کی کوششوں سے بہت سے تاتاری اپنے اس تعصب پر، جو انہیں روسی زبان اور یورپی "عیسائی" کلچر کے خلاف تھا، غالب آنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اس کے بعد اس کے شاگردوں اور دوسروں نے نئی روشنی کے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا یہاں تک کہ ترکی چغتائی زبان کے بجائے تاتاری زبان اس علاقے کی علمی وادبی زبان بن گئی۔ انیسویں صدی کے وسط میں وولگا اور یورال کے تاتاریوں میں تعلیمی اور نشرواشاعت کی سرگرمیاں بھی کافی بڑھ گئی تھیں۔ ملکہ کیتھرائن دوئم کے مذہبی

آزادی کے اعلان کے بعد تاتاری مسلمانوں نے مذہبی کتابیں چھاپنے کی بھی اجازت حاصل کرلی۔ ۱۸۵۳ء۔۱۸۵۹ء کی مدت میں صرف قازان یونیورسٹی نے کوئی سواتین لاکھ کتابیں چھاپیں۔ جن میں قرآن مجید کے علاوہ تاتاری زبان کی کتابیں بھی تھیں۔۱۸۵۳ء۔۱۸۶۴ء کے درمیانی عرصے میں تاتاریوں کی کل مطبوعہ کتابوں کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ اسی طرح دینی مدارس کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہوگیا۔ ۱۸۶۰ء میں وسط وولگا اور جنوبی یورال میں کوئی ۱۸۵۹ تاتاری مکتب تھے، جو مساجد سے ملحق تھے اور ان میں ملا تعلیم دیتے تھے۔

انیسویں صدی کے وسط میں تاتاریوں کی تیز رفتار ثقافتی اور اقتصادی ترقیوں سے روسی حکومت کے حلقوں میں اندیشے پیدا ہونے لگے۔ اس کے علاوہ روس کی ترک آبادی میں کافی اضافہ بھی ہوگیا تھا اور ۱۸۶۵ء میں وہ ایک کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ اسی زمانے میں روس کے حکمران طبقوں میں اتحاد سلاوی کا رجحان بڑھا۔ نیز روس کا آرتھوڈکس چرچ کا محافظ ہونا اور ترکی کے خلاف جنگوں میں (۱۸۵۴ء۔۱۸۵۵ء اور ۱۸۷۷ء۔ ۱۸۷۸ء) سلاویوں کا حصہ، اس نے قدرتاً مسلمان رعایا کے معاملے میں روسی حکومت کے رویے پر معاندانہ اثر ڈالا۔ اور اسی زمانے میں یورپ اور روس میں قومیت کے عروج کے ساتھ ساتھ تاتاریوں میں بھی قومی شعور ابھرنے لگا تھا۔ پھر ریلوں کے بننے اور بہتر سمندری مواصلات کی وجہ سے روس کے مختلف ترک باشندوں میں آپس میں، اور ان میں عثمانی ترکی کے درمیان تعلقات قائم کرنے میں بڑی آسانیاں ہوگئیں۔ اور ظاہر ہے اس وقت عثمانی ترکی کا، بحیثیت اس کے کہ اس کا سربراہ سلطان اور خلیفہ ہے اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جیسے مقامات مقدسہ اس کے تحت ہیں، روس کے مسلمانوں میں بڑا وقار اور احترام تھا۔

یہ حالات تھے جبکہ روس کے تاتاری مسلمانوں میں قسطنطنیہ یعنی استنبول سے وابستگی بڑھی، اور اس کی وجہ سے ان میں پان اسلامزم اور پان ترکزم کا پہلے پہل بیج پڑا۔ ۱۸۵۶ء میں جنگ کریمیا کے موقع پر کوئی ایک لاکھ چالیس ہزار کریمیا کے ترک ہجرت کرکے ترکی چلے گئے۔ اسی طرح تاتاری ترکوں نے روسی فوجوں میں بھرتی ہونے سے انکار کردیا، اور ان میں بھی ترکی کو ہجرت کرجانے کے خیالات پھیلنے لگے۔ اسی زمانے میں وہ تاتاری جو عیسائی ہوئے تھے، دوبارہ مسلمان ہوگئے۔

اسماعیل بے گسپرنسکی

یہ وہ وقت ہے جب روسی تعلیم پاتے ہوئے کریمیا کے ایک تاتاری اسمٰعیل بے گسپرنسکی آگے آتے ہیں اور وہ تاتاریوں کی تعلیمی ترقی، انکے قومی احساسات کی بیداری کے علمبردار بنتے ہیں۔

انیسویں صدی میں روسی ترکوں کی تاریخ میں گسپرنسکی (۱۸۵۱ء۔۱۹۱۴ء) کی شخصیت سب سے ممتاز ہے انہوں نے کریمیا اور ماسکو میں تعلیم پائی تھی بعد میں وہ استنبول میں رہے۔ اور وہاں سے پیرس گئے۔ ان دو شہروں کے قیام نے ان کی بعد کی سرگرمیوں پر جو آزادی پسند (لبرل) قوم پرستانہ جذبات سے بھرپور تھیں گہرا اور پائیدار اثر ڈالا۔ گسپرنسکی پر سلاوزم (اتحاد سلاو) اور فرانس کے تاثرات کے علاوہ ہم عصر عثمانی ترکی کی دو فکری تحریکوں کا بڑا اثر پڑا۔ ایک تو نوجوان عثمانی ترکی تحریک، جس کے بانی نامق کمال، شناسی اور ضیا پاشا اہل قلم تھے۔ یہ تحریک تنظیمات (۱۸۴۰ء۔۱۸۸۰ء) کے اصلاحی دور میں ابھری تھی، اور دوسری فکری تحریک جس نے ۱۸۶۰ء۔۱۸۷۰ء میں استنبول کے نوجوان دانش وروں کو متاثر کیا اور جو اسماعیل بے گسپرنسکی کے لیے بھی منبع فیضان بنی، پان اسلامزم تھی۔ یہ آخرالذکر تحریک سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء۔ ۱۸۹۷ء) کی تخلیق تھی۔

کریمیا واپس آنے کے بعد اسماعیل بے گسپرنسکی نے پہلے تو درس و تدرس کی سرگرمیاں شروع کیں اور ۱۸۸۱ء کے بعد انہوں نے سید جمال الدین افغانی کی ہدایات کے مطابق روس کے تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کے پروپیگنڈے کا آغاز کیا۔ ۱۰/اپریل ۱۸۸۳ء کو ان کے اخبار ''ترجمان'' کا پہلا پرچہ نکلا۔ گسپرنسکی کے اس اخبار نے تقریباً پچیس سال تک روسی ترکوں کے ذہن کو بنانے میں مدد دی۔ موصوف کی عملی صلاحیتیں صرف درس و تدریس اور صحافت تک ہی محدود نہ رہیں، بلکہ وہ سب سے پہلے اور سب سے نمایاں ایک قومی اور سماجی رہنما تھے۔ وہ روس کے مختلف مسلمان صوبوں میں مسلسل دورے کرتے۔ اور اپنے ہم وطنوں کو متحد کرنے کے لیے قلم کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے بھی کام لیتے۔ غرض ۱۸۸۰ء۔۱۸۹۰ء میں گسپرنسکی روس میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور سب سے زیادہ با اثر ترک لیڈر تھے، اور اس کے علاوہ بیرونی ملکوں میں ان کی بات غور و توجہ سے سنی جاتی تھی۔

نظریتاً اسماعیل بے گسپرنسکی اگرچہ تمام دنیائے اسلام کے اتحاد کے حامی تھے، لیکن عملاً ان کی دعوت روس کے تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی تھی، اور ان کی وجہ سے قدرتاً ان کی یہ دعوت روس کے تمام ترکوں کے اتحاد کی وجہ بن گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ترکوں کو قرون وسطیٰ کی نفسیات سے نکال کر جدید یورپی ثقافت کے دائرے میں بھی لانا چاہتے تھے۔ وہ مسلمان عورتوں کی آزادی کے حامی اور مسلمانوں کی سماجی زندگی میں بعض اصلاحات کے داعی تھے۔ لیکن وہ اسلامی ثقافت کے بھی مؤید تھے چنانچہ ایک طرف جہاں ان کا یہ اصرار تھا کہ اسلامی مدارس میں ترکی پڑھائی جائے، وہاں وہ اس کی ضرورت بھی محسوس کرتے تھے کہ عربی جو قرآن مجید اور اسلامی ثقافت کی زبان ہے، اس کی بھی تعلیم ہو۔

البتہ وہ عربی گرائمر کی فارسی میں لکھی ہوئی پرانی درسی کتابوں کے بجائے استنبول کی شائع کردہ ترکی زبان میں لکھی ہوئی عربی گرائمر کی کتابیں پڑھانے پر زور دیتے تھے۔

مسلمانوں کے ثقافتی اتحاد کی اپنی اس جدوجہد میں گسپرنسکی روس کے اسلامی مدارس اور اس کی صحافت کے لیے عثمانی سلطنت کی ترکی زبان کو ادبی زبان بنانا چاہتے تھے چنانچہ ان کا اخبار ''ترجمان'' اسی زبان میں جسے اس وقت نوجوان عثمان ترک عربی اور فارسی الفاظ سے پاک کررہے تھے، نکلتا تھا۔ یہ زبان گوکریمیاوالوں کے لیے تو ایک حد تک قابل فہم تھی لیکن وولگا اور یورال، اور قازقستان اور وسط ایشیا کے ترکوں کے لیے اسے باقاعدہ پڑھے بغیر سمجھنا مشکل تھا۔ اس لیے گسپرنسکی تمام ترکوں کے لیے جس لسانی وحدت کے داعی تھے، وہ وجود میں نہ آسکی۔

اسلامی اور ترکی اتحاد کے ساتھ ساتھ اسماعیل بے گسپرنسکی روسی حکومت اور روسیوں سے بھی دوستانہ تعلقات رکھنے کے حق میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ روس کو ترکی اور ایران سے اچھے تعلقات رکھنے چاہیے۔ بلکہ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ آئندہ تاریخ تمام ترکوں کو اس طرف لے جاسکتی ہے کہ وہ روس کے ساتھ ہی مل کر ایک ہی نظام میں رہیں۔ گسپرنسکی کی زیادہ تر توجہ تعلیم کی طرف رہی۔ انہوں نے خود ایک اصلاح شدہ نظام تعلیم کا مدرسہ قائم کیا۔ جو بعد میں نئے طریقہ تعلیم یعنی ''اصول جدید'' کے مدارس کے لیے نمونہ بن گیا۔ ''اصول جدید'' ترقی پسند تاتاری مصلحین کا نعرہ تھا اور اسی مناسبت سے انہیں ''جدیدیین'' کہا جانے لگا۔ ان نئے قسم کے مدارس میں عربی پڑھانے کا نیا طریقہ رائج کیا گیا۔ اور اگرچہ ان مدارس میں قران مجید اور فقہ کی تعلیم بحالہ جاری رہی ۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاضی ، تاریخ اور جغرافیہ بھی شامل نصاب کیا گیا۔

آگے چل کر ''اصول جدید'' کے یہ مدارس آہستہ آہستہ پرانی روایات سے الگ ہوتے گئے۔ اور ان میں قدیم مذہبی فضا کی جگہ جدید سیکولر (غیر مذہبی) فضا پیدا ہونے لگی۔ اور یہ مسئلہ وجہ نزاع بن گیا پر انوں جنہیں ''قدیمین'' کہتے تھے اور ''اصول جدید'' کے حامیوں یعنی ''جدیدیین'' میں لیکن ''اصول جدید'' کے مدارس نے بڑی سرعت سے ترقی کی ، چنانچہ ۱۹۱۴ء میں کوئی پانچ ہزار کے قریب تاتاری اور بعض دوسرے مدارس میں یہ طریقہ رائج ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس وسط ایشیا کا کیشیا اور وولگا یورال کے بعض قدامت پسند مدارس میں حسب دستور پرانا طریقہ تعلیم ہی رائج رہا۔مختصراً تاتاری معاشرے نے گسپرنسکی کی اصلاحات کو بہت حد تک قبول کرلیا ، اور اس کے بوژدائی طبقے کا اس میں فی الحقیقت فائدہ بھی تھا، بیسویں صدی کے اوائل میں تاتاری دانشوروں کا کافی زور بڑھ گیا۔ اوران کا مرکزی شہر قازان

اپنی کثیر التعداد درس گاہوں، دارالاشاعتوں اور زبردست عقلی سرگرمیوں کی وجہ سے دنیائے اسلام کے چار علمی و ثقافتی مرکزوں میں سے ایک شمار ہونے لگا۔ اگرچہ تاتاریوں کی اکثریت پہلے کی طرح مذہبی معاملات میں بڑی راسخ رہی۔ لیکن سیاسی اور سماجی فکرونظر کے اعتبار سے وہ بخارا اور دوسرے روایتی مسلم افکار کے مراکز کے بجائے ماسکو، پیٹرزبرگ، استنبول اور ایک حد تک پیرس کے زیر اثر آ گئی۔

قومی جدوجہد کا آغاز

روسی ترکوں میں قومی جدوجہد کا آغاز پہلے پہل دراصل ۱۹۰۵ء کے ہی قریب ہوسکا، اس سے پہلے تاتاری ''جدیدیین'' کی تمام تر سرگرمیاں صرف ثقافتی و مذہبی نوعیت کی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں ایک پرجوش نوجوان تاتاری لبرل کو جو اشتراکی پروپیگنڈے کے زیر اثر تاتاری معاشرے میں بھی طبقاتی جدوجہد اور داخلی تنازعات کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اسماعیل بے گسپرنسکی نے کہا تھا۔ عزیز من! تم ابھی ناتجربہ کار ہواس لیے تم اصلاحات پر اتنے ریجھے ہوئے ہو۔۔۔۔وہ لوگ جن کی کوئی ثقافت نہ ہو، ان کے پاس صنعتیں کہاں سے آئیں گی، اور صنعتوں کے بغیر داخلی تنازعات نہیں ہوسکتے۔ ہمارے پیش نظر اس وقت اپنی ثقافت کی تعمیر ہے۔

لیکن وہ تاتاری اور آذربائیجانی نسل جس نے ۱۸۹۰ء میں سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا تھا، وہ زیادہ عرصہ تک انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اسی میں سے ترک قوم پرستی کی تحریک کی نئی قیادت اُبھری۔ اس میں سب سے پیش پیش ایک صاحب رشید ابراگیموف تھے، جو محکمہ امور مذہبیہ میں قاضی رہ چکے تھے۔ آپ ترک وطن کرکے استنبول گئے، اور وہاں روس کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کیا۔ ۱۹۰۴ء میں ترکی سے وہ واپس روس بھیج دیئے گئے، جہاں آکر انہوں نے ''آئینہ'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا، جو روسی ترکوں کے اتحاد کا نقیب تھا۔ اسی سال ایک اور ترک اہل قلم علی کمال کے قاہرہ سے شائع ہونے والے ایک اخبار ''ترک'' میں ایک مضمون چھپا، جس کے ترکیت اور قومی تحریک کے آئندہ ارتقاء پر بڑے دوررس اثرات پڑے۔ مضمون نگار ایک تاتاری دولت مند صنعت کار کا ایک صحافی نوجوان لڑکا یوسف نامی تھا۔ اس نے لکھا کہ اس دور میں جب کہ مسلمان ملکوں میں سیکولرزم آرہا ہے، جہاں جمال الدین افغانی اور گسپرنسکی کے پان اسلامزم کے خیالات فرسودہ ہوچکے ہیں، وہاں عثمانی ترک سلطنت کے مختلف المذاہب اور مختلف النسل باشندوں پر مشتمل ایک متحد اور وفاقی عثمانی قومیت کی تعمیر بھی نہیں ہوسکے گی۔ کیونکہ ترکی سلطنت کے ان مسیحی اور مسلمان ہر دو مذہب کے باشندوں میں قومی تحریکیں ابھر رہی ہیں ان دونوں نظریوں کے خلاف اس مضمون نگار نے یہ خیال پیش کیا کہ عثمانی

ترک سلطنت اور روسی سلطنت کے تمام ترکوں کو سیاسی طور پر متحد کیا جائے، اور ان کے ساتھ اردگرد کے دوسرے ملکوں میں جو ترکی اقلیتیں ہیں، وہ بھی شامل کی جائیں۔ اس نئے سیاسی عقیدے کو ''ترکزم'' یا ''پان ترکزم'' کا نام دیا گیا۔ ظاہر ہے یہ نظریہ کافی خطرناک تھا، کیونکہ اس کی سب سے پہلی زد تو روس پر پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں مضمون نگار کی یہ رائے تھی کہ روس کی مخالفت کو اس طرح ختم کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ طاقتیں جو زار روس کی سلطنت کے خلاف ہیں، ان سے اتحاد کرلیا جائے۔ ایک ''مشترک ترک قومی تحریک'' کے نصب العین کے متعلق یہ پہلا بیان تھا جو قاہرہ کے اخبار ''ترک'' میں شائع ہوا۔ بہت جلد یہ نظریہ ''پان ترکزم'' کے لیے ایک دینی عقیدہ بن گیا۔ اور اس کے ترکوں کے افکار اور رجحانات پر بڑے گہرے اور پائیدار اثرات پڑے۔ بعض اور روسی ترک اخبارنویسوں نے جو روس سے ہجرت کرکے دوسرے ملکوں میں آگئے تھے، اس زمانے میں ان خیالات کی تائید کی۔

۱۹۰۵ء میں سلطنت روس میں جو عام انقلابی جدوجہد ہوئی، اس کے نتیجے میں روس کے ترک مہاجر دوسرے ملکوں سے واپس وطن آگئے۔ اور اب ان کی سرگرمیاں اندرون روس شروع ہوگئیں۔ اوائل مارچ ۱۹۰۵ء میں کوئی اسی تاتاری صنعت کار، ایڈوکیٹ، مذہبی اور سماجی رہنما، معلم اور تاجر قازان میں جمع ہوئے اور انہوں نے آل روسی مسلم کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد اس کانفرنس کے باقاعدہ اجلاس ہونے لگے، ان میں روسی ترکوں کے حقوق کے متعلق اہم فیصلے کئے جاتے۔ اسی دوران میں روسی پارلیمنٹ (ڈوما) کے انتخابات ہوئے، جن میں ترک نمائندے بھی منتخب کئے گئے۔ جب اس طرح سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوگیا تو روسی ترکوں میں مختلف سیاسی گروہ بھی ظہور پزیر ہونے لگے۔ ایک پارٹی ''اتفاق'' کے نام سے بنی۔ اور جو قدرے انتہاپسند تھے، انہوں نے ''تاتاری سوشلسٹ انقلابی'' نام کا اپنا ایک گروپ بنایا۔ ایک چھوٹا سا گروہ سوشل ڈیموکریٹس کا تھا۔ جس نے آگے چل کر تاتاری بالشویک گروپ کی شکل اختیار کی۔ جہاں تک روسی ترکوں میں سے دائیں بازو والوں کا تعلق ہے، ان میں ایک تو محکمہ امور مذہبیہ کے قدامت پسند علماء تھے۔ دوسرے پیٹرزبرگ کے مسلمان شرفاء۔ انہوں نے اپنی پارٹی کا نام ''صراط مستقیم'' رکھا، یہ لوگ روسیوں کے دائیں بازو سے تعاون کرتے تھے۔ اور ''جدیدیین'' کے مقابلے میں ''قدیمین'' کہلاتے تھے، انکا اپنا اخبار بھی تھا۔ ''قدیمین'' کے روحانی رہنما ولی حضرت کو ''جدیدیین'' اور ''اتفاق'' پارٹی کے لیڈروں سے، جنہیں وہ ملحد اور خدا اور رسول صلعم کے دشمن سمجھتے تھے، اتنی سخت نفرت تھی کہ اس نے زار روس کی پولیس سے یہ مخبری کرنے سے بھی تامل نہ کیا کہ ''اصول جدید'' کے ترک مدارس میں ''پان ترکزم'' کا پروپیگنڈہ ہوتا ہے (اس کی وجہ سے بعض

مدارس بند کردیئے گئے۔) ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد یہ سب رپورٹیں جو ''صراط مستقیم'' سے تعلق رکھنے والے قدامت پرست ملاوں نے ''اصول جدید'' والوں کے خلاف زار کی پولیس کو دی تھیں، شائع کردی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاّ ان ائمہ اور خطباء تک کو انقلابی سمجھتے تھے، جو جمعہ کی نمازوں میں عربی کی جگہ تاتاری زبان میں خطبہ دیتے تھے۔

قازقستان

قازقستان پر گوروسی تسلط کی ابتداء ۱۷۲۶ء میں ہوئی، لیکن ۱۸۶۴ء میں کہیں جا کر اس پر روس کا پورا قبضہ ہوسکا۔ گوقازقستان سے پہلے پہل اسلام ترکوں کے گروہ ازبکوں کے ذریعہ پہنچا تھا، لیکن قازقوں میں اسلامی زندگی اور اسلامی ثقافت کو فروغ روسی قبضے کے بعد وولگایورال کے تاتاریوں کے ہاتھوں ہوا۔ قازقستان میں یہ تاتاری تاجروں اور روسی سلطنت کے اہل کاروں کی حیثیت سے پہنچے تھے۔ قازقوں کا ایک طبقہ ان روسی دانشوروں سے بھی، جو ان کے ہاں سرکاری عہدوں پر فائز تھے، متاثر ہوا۔ قازقوں کے اس طبقے میں سے ایک شخص ولی خانوف (۱۸۳۵ء۔۱۸۶۵ء) نامی تھا۔ یہ ایک اعلیٰ قازق خاندان سے تھا، جسے براہ راست چنگیزخاں کی اولاد میں سے ہونے کا فخر تھا۔ اس نے روسی کیڈٹ اکیڈمی میں تعلیم پائی پھر وہ روسی فوج میں داخل ہوا۔ اور بعد میں اس کی ایک جغرافیہ دان اور ماہر علم الانسان کی حیثیت سے شہرت ہوئی۔ ولی خانوف روسی افسروں اور مالدار قازقوں ہردو سے اپنے غریب اور خانہ بدوش عوام کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے وہ قازقوں میں تعلیم اور روسی اور یورپی ثقافت پھیلا کر ان کا ذہنی اور اقتصادی معیار بلند کرنے کا داعی تھا۔ ولی خانوف دولت مند قازق طبقہ اشراف کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قبائلی نظام اور فرسودہ نام نہاد اسلامی ثقافت قازقوں کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اس ضمن میں وہ لکھتا ہے: ''آج ماوراالنہر (دریائے جیحوں اور دریائے سیحوں کا دوابہ) میں جہالت اور افلاس کا دوردورہ ہے۔ سمرقند، تاشقند، فرغانہ، خیوااور بخارا کی شہرہ آفاق لائبریریاں اور سمرقند کی تاریخی رصدگاہ تاتاریوں (یہاں مراد چنگیزخاں اور ہلاکو کے دور کے منگول ہیں) کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے تباہ ہوچکی ہیں۔ اور اب بخارا کی عقلیت دشمنی اور رجعت پرستی کا یہ حال ہے وہاں سوائے مذہب کے اپنے خاص فرقے کے ہر چیز مردود ہے اور تو اور اپنی عظیم تاریخی یادگاروں کو اس بنا پر برا بھلا کہا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ کی تخلیقی قوت کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ ولی خانوف تاتاری ملاؤں کے بھی خلاف تھا۔ اور وہ اسلامی دینی مدرسوں کے بجائے اپنے خانہ بدوش قازق عوام کے لیے روسی قازق سکول چاہتا تھا۔ بدقسمتی سے اس کی عمر نے وفا نہ کی ایک تو سخت دماغی محنت اور دوسرے روس کی سخت

سردی نے اس کی صحت تباہ کردی اور وہ تیس سال ہی کی عمر میں انتقال کرگیا۔

ولی خانوف کے دو ہم نوا اور تھے، ایک شاعر ابائی اور دوسرا ایک معلم الت بن سربان ، یہ دونوں بھی اس کی طرح روسی دانشوروں سے متاثر ہوئے، بات یہ ہے کہ ایک تو قازقوں کی اکثریت خانہ بدوش تھی، دوسرے وولگا یورال کے تاتاریوں سے جغرافیائی لحاظ سے دور ہونے کی وجہ سے ان کی ترکی زبان قازقوں کی ترکی سے الگ تھی، پھر وہاں اسلامی معاشرت بھی زیادہ نہ پھیلی تھی، اس قازق بالعموم آل روسی مسلم سیاسی وثقافتی سرگرمیوں سے بے تعلق رہے۔

وسط ایشیا کے ترک علاقے

وسط ایشیا کو روس نے ۱۸۶۵ء۔۱۸۷۶ء میں فتح کیا۔ روسی سلطنت کے کسی مسلم علاقے میں یورپی ثقافت اور نئے حریت پسندانہ خیالات کی اتنی سخت مخالفت نہیں ہوئی جتنی کہ وسط ایشیا میں ہوئی۔ اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہاں کی آبادی ابھی انسانی ارتقا کی ابتدائی منزلیں طے کررہی تھی۔ اور اس کے لیے ان نئے ترقی یافتہ خیالات کو اپنانا مشکل تھا۔ بلکہ اس کا سبب تھا ان کی زمانہ ماضی کی شاندار تہذیب وثقافت، جواب بے جان اور فرسودہ ہوچکی تھی۔ وسط ایشیائی تہذیب کا ایک مستند ترین مورخ لکھتا ہے: ''قرون وسطیٰ کے مقابلے میں انیسویں صدی کا ترکستان ونیائے اسلام کے سب سے پست ملکوں میں ہے''۔ وسط ایشیا کی یہ سرزمین جس نے صدیوں پہلے دنیا کوالفارابی اور ابن سینا جیسے عہد وسطیٰ کے عظیم الشان مفکر، البیرونی اور الخوارزی جیسے ممتاز سائنس داں، اور رودکی اور نوائی جیسے عظیم شاعر دیئے ، وہ سولہویں صدی کے اوائل ہی سے ثقافتی اور اقتصادی طور پرفرسودگی کا شکار ہونا شروع ہوگئی تھی۔ جب مشرق بعید سے براہ راست سمندر کے راستے تجارت ہونے لگی، اور چین اور ہندوستان کی براعظمی تجارت میں وسط ایشیا کے ان نخلستانوں کو جواجارہ واری حاصل تھی، وہ ختم ہوگئی ۔تو ان لوگوں کی اقتصادی فارغ البالی کی عمارت ایک دم زمین پرآرہی۔تقریباً اسی زمانے میں ایران میں شیعہ حکومت برسراقتدار آگئی، اور اس کی وجہ سے اس حکومت کے بخارااور سمرقند میں جو سنی مخالف تھے، ان کا بحیرہ روم کے اروگرد مشرق قریب کے ملکوں میں آباد مسلمانوں سے تعلقات منقطع ہوگئے۔ ایک تو وسط ایشیا جغرافیائی اعتبار سے یوں بھی دورافتادہ تھا، دوسرے وہ اس طرح بتدریج دنیائے اسلام سے زیادہ سے زیادہ علیحدہ ہوتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں معنوی اور روحانی جمود غالب آتا چلا گیا۔

وسط ایشیا کے تہذیبی وثقافتی زوال کے یہ اسباب کچھ کم نہ تھے کہ اس کے علاوہ وہاں ۱۰۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک خانہ بدوش ترک حملہ آوروں کے مسلسل سیلاب آتے رہے جن سے وہاں کا تمام نظام

آب پاشی تہ وبالا ہوگیا، بڑے بڑے شہر تباہ ہوگئے نخلستانوں کی مستقل آبادیوں کا بڑا حصہ مرکھپ گیا۔ اور ان کی جگہ نسبتاً کم تہذیب یافتہ خانہ بدوش آگئے خاص طور سے پندرہویں صدی کے اوائل میں ازبک جو ماوراالنہر میں ساڑھے تین سو سال سے مسلط چلے آتے تھے، وسط ایشیا کی طرف بڑھے اور وہاں ان کا قبضہ ہوگیا۔ ازبک حکمران خواتین اپنی روایتی معاشرت میں ہر تبدیلی اور اپنے سخت قسم کے جامد سنی مسلک سے ہر انحراف کی مخالفت کرتے تھے۔ چنانچہ عہد وسطیٰ کے فلسفے اور سائنس کی تعلیم ممنوع کردی گئی اور اس کی جگہ کٹر قسم کا علم کلام رائج ہوا، جس نے وسط ایشیائی ذہنی زندگی کو بالکل بے جان کردیا۔ اور آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ اس سرزمین کی تہذیب وثقافت جامد ہوکر رہ گئی۔

بخارا

روس نے برطانیہ کی برہمی کے خیال سے وسط ایشیا کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھائے تھے اور وہاں بجائے براہ راست حکومت کرنے کے مقامی قوانین کو ہی رہنے دیا تھا۔ اور یوں بھی وسط ایشیا کے معاملے میں روس کی شروع ہی سے وہاں کے باشندوں کی ثقافتی اور مذہبی زندگی میں کم سے کم عدم مداخلت کی پالیسی رہی۔ اسی طرح اسلامی دینی مدارس کے نظام کو بھی اس نے حسب سابق رہنے دیا۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق وسط ایشیا میں ۶ ہزار مکتب اور ۳۲۸ مدرسے تھے، جن میں مجموعی طالب علم دس لاکھ تھے۔ خان بخارا کی مملکت میں ۶۴۴۰ مکاتب اور ۱۳۲۰۰ مدرسوں میں کوئی بارہ لاکھ طالب علم تھے۔ ان مدارس میں زیادہ تر عام مذہبی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن نہ ان میں سائنس داخل نصاب تھی نہ آرٹس کے فنون، بلکہ تاریخ اسلام تک بھی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود وسط ایشیا اور بالخصوص بخارا کے بہت سے مدرسے جیسا کہ میر عرب کا ایک مشہور مدرسہ تھا۔ اعلیٰ قسم کی مذہبی، فقہی اور علم کلام کی تعلیم دیتے تھے، اور ان کی انیسویں صدی تک پوری اسلامی دنیا میں سب سے بڑھ کر راسخ العقیدہ درس گاہوں کی حیثیت سے بڑی شہرت تھی۔

گو روسی ثقافتی اثرات کو مقامی آبادی میں پھیلانے کے لیے حکومت روس کی طرف سے وسط ایشیا میں جو روسی سکول کھولے گئے تھے، ان کی طرف مسلمان طالب علموں کو مرغوب کرنے کے لیے کافی کوششیں کی گئیں، لیکن مسلمان والدین اس کے لیے تیار نہ تھے کہ وہ اپنے بچوں کو عیسائی سکولوں میں بھیجیں۔ حکومت کی جملہ مراعات کے باوجود ۱۹۱۲ء میں وسط ایشیا کے روسی ثانوی سکولوں میں کل ۱۴ ہزار طالب علموں میں سے مسلمان طلبا صرف ۱۹۷ تھے۔ البتہ ایک دوسری قسم کے سرکاری سکول جہاں ابتدائی جماعتوں میں تو مقامی زبان میں اور اعلیٰ جماعتوں میں روسی میں تعلیم دی جاتی تھی، زیادہ کامیاب رہے۔

لیکن مقامی آبادی کی طرف سے ان کے راستے میں بھی طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کی طرف سے حکومت روس سے جو مطالبات کئے گئے، ان میں سے ایک اہم مطالبہ یہ تھا کہ یہ دولسانی سرکاری سکول بند کردیئے جائیں اور دینی مکاتب سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کو نئے سکولوں میں مزید تعلیم کے لیے جو وظائف دیئے جاتے ہیں، وہ نہ دیئے جائیں۔ بہر حال ان تمام رکاوٹوں کے باوجود پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) سے کچھ پہلے ان سکولوں کی طرف مقامی آبادی کی زیادہ توجہ ہونے لگی تھی۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں جب وسط ایشیا کے ترک علاقے سلطنت روس کی اقتصادی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئے تو قدرتاً ان پر نئے اثرات زیادہ پڑنے لگے۔ اس مرحلے پر ازبک اور تاجک متوسط طبقہ، جسے آزادی پسند مسلم طالب علموں کی تائید حاصل تھی، آگے آتا ہے، اور ایک طرف جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں اور دوسری طرف علماء کا معاشرے میں جو مقام تھا، اس پر فائز ہونے کی کوشش کرتا ہے، وسط ایشیا کے اس نئے رجحان کا اولین نمائندہ ایک بخاری سیاستدان اور شاعر احمد مخدوم دانش (۱۸۲۷ء۔۱۸۹۷ء) تھا۔ وہ امیر بخارا کے سفیر کے سیکرٹری کی حیثیت سے پیٹرزبرگ گیا۔ اور وہاں وہ روسی اسکولوں، بے پردہ عورتوں، کتابوں اور رسالوں کی کثرت، روسی دانشوروں اور لوگوں کے اعلیٰ معیار زندگی سے بڑا متاثر ہوا، جب وہ روسی دارالسلطنت سے واپس وطن لوٹا،تو وہ وسط ایشیا کا پہلا یورپیست اور مغربیت کا نقیب تھا۔ اپنی ایک کتاب میں وہ بخارا کے شاہی خاندان پر یوں برستا ہے:

> ''امیر، وزیر، مذہبی طبقے اور اشراف سب ایک سے ہیں۔ اے قاری! تم خود ہی دیکھو۔ یہ امیر، جو پارسا اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کا سربراہ اور تمہارا سلطان ہے کس قماش کا آدمی ہے۔تم اگر اپنے گرد وپیش دیکھوگے،تو تم ایک عیاش اور مستبد جابر پاؤ گے۔ اس کا قاضی القضاۃ پیٹو اور منافق ہے۔ ایسے ہی اس کا محتسب اور پولیس کا اعلیٰ افسر ہے۔ آخرالذکر ہر وقت پیئے رہتا ہے۔ وہ جواری ہے اور چوروں اور ڈاکوؤں کا سرپرست ہے۔''

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں دانش کے یہی الفاظ تھے، جنہوں نے امیر بخارا کے خلاف آزادی پسند (لبرل) بخاریوں کی جدوجہد میں سب سے موثر دلیل کا کام دیا۔ احمد مخدوم دانش کے بعد اس کے شاگردوں نے اس مہم کو جاری رکھا، اور جب حکومت بخارا

کی طرف سے ان پر سختیاں شروع ہوئیں۔ تو ان میں سے اکثر ترک وطن کر گئے، عین اسی زمانے میں کریمیا اور وولگا یورال کے تاتاریوں کے اثرات ازبکوں اور تاجکوں تک پہنچے اور ان نواح میں بھی اسماعیل بے گسپرنسکی کے نئے آزادانہ (لبرل) خیالات کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ مسلم لبرل تحریک کے اولین علمبرداروں اور قدامت پسند اکثریت میں سخت ٹکر ہوئی یہ لبرل نئے طریقہ تعلیم اور پرانی روایتی معاشرت میں تبدیلیوں کو مسلم معاشرے کو تباہی سے بچانے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے، اور اس کے برعکس قدامت پسند ان تبدیلیوں کو مسلمانوں کی خاندانی زندگی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیتے تھے۔

جدیدیین اور قدیمین میں ٹکر

ان دو مخالف نظریوں کے تصادم کا سب سے نمایاں مظاہرہ سکولوں کے بارے میں ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں اسماعیل بے گسپرنسکی خود وسط ایشیا آئے اور ان کے زیر اثر وہاں نئے قسم کے اصلاح شدہ مدارس کھلنے لگے اور لبرل تحریک نے بھی زور پکڑنا شروع کیا۔ تاشقند، جو روسی وسط ایشیا کا انتظامی اور ثقافتی مرکز تھا۔ لبرل تحریک کے حامیوں کا محور بن گیا۔ جب خاص روس میں انقلابی سرگرمیاں عام ہوئیں۔ تو وسط ایشیا کے لبرل مسلمان لیڈروں کے بھی حوصلے بڑھے اور تاشقند سے ''جدیدیین'' نے متعدد رسالے نکالنے شروع کیے جن میں ''خورشید''، ''شہرت''، ''ایشیا'' اور ''صدائے ترکستان'' خاص طور پر نمایاں تھے۔ تاشقند کے بعد لبرل تحریک کا دوسرا اہم مرکز سمرقند تھا۔ اسی طرح فرغانہ میں بھی ترک لبرل تحریک کے قدم پہنچے۔ اور وہاں سے بھی ''جدیدیین'' نے اپنے رسالے نکالے۔ ترکوں کی یہ سب صحافتی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء میں روسی آئین کے نفاذ کے بعد شروع ہوئی تھیں۔ ۱۹۰۹ء میں ''جدیدیین'' نے اپنی تحریک کو مزید تقویت دینے کے لیے ایک ثقافتی سوسائٹی قائم کی، جو لبرل صحافت کو ترقی دینے اور تعلیمی اصلاحات کو مزید تقویت دینے کے لیے ایک ثقافتی سوسائٹی کی نشرواشاعت کے لیے وقف تھی، یہ سوسائٹی روسی حکام کی اجازت سے وجود میں آئی تھی۔

لیکن ایک وقت آیا کہ روس کے سرکاری حلقوں میں ترکوں کی اس لبرل تحریک سے خدشے پیدا ہونے لگے اور انہوں نے اس کے خلاف اقدامات کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ وسط ایشیا میں شائع ہونے والے وولگا یورال کے تاتاریوں کے اخبارات اور مدارس بند کیے جانے لگے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک طرف ازبکوں اور تاجکوں اور دوسری طرف وولگا یورال کے تاتاریوں میں جو دراصل لبرل تحریک کے ہراول تھے، روسی حکام کی طرف سے اختلاف و منافرت کے بیج بونے کی پالیسی شروع کی

گئی۔ ''جدیدیین'' کے اس بڑھتے ہوئے اثر کی مخالفت کے لیے حکومت روس نے قدامت پسند مسلمانوں کی تائید حاصل کی۔ اور اب اس کی نظر عنایت خاص طور پر قدامت پسند مسلم مدارس و علماء کی طرف ہوگئی۔ یہ قدامت پسند گروہ اتفاق سے ''جدیدیین'' کی اصلاحی سرگرمیوں کو روسی حکومت سے بھی زیادہ ناپسند کرتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں تاشقند کے اخبار ''ترقی'' نے قدامت پسند مدارس اور ان کے استادوں پر اعتراض کیا، تو اس سے قدامت پسند اور ''قدیمین'' اتنے بگڑے کہ تاشقند کے علماء کے ایک اجتماع میں اخبار مذکور کے ایڈیٹروں اور حامیوں کو کافر قرار دیا گیا اور وہ مساجد سے نکال دیئے گئے۔

بخارا اور خیوا میں جو براہ راست حکومت روس کے زیر انتظام نہ تھے، ''جدیدیین'' کے لیے حالات اور بھی زیادہ سازگار تھے۔ بخارا میں تو خاص طور سے علماء کا غیر محدود اثر ونفوذ تھا۔ اور بخارا کے فرمانروالبرل خیالات سے مطلق کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کی مخالفت کے باوجود ولگا کے تاتاریوں کی کوششوں سے اور مقامی روسی حکام کی سرپرستی میں بخارا میں بھی بعض نئے سکول قائم ہوگئے۔ اس ڈر سے کہ نئے سکولوں کی کامیابی کی بخارا کے قدامت پسند مدارس پر زد پڑے گی، علماء نے ان سکولوں کو بند کرانے کے لیے ایسی متعصبانہ مذہبی فضا پیدا کردی کہ ۱۹۱۰ء میں سخت قسم کے سنی شیعہ فسادات ہوگئے۔ جنہیں روسی فوج نے آکر دبادیا۔ گو بخارا کے امیر اور وہاں کے علماء کو دوسرے علاقوں کے روسی مسلم سیاسی حلقوں کے دباؤ کے تحت وقتی طور پر جھکنا پڑا تھا اور بخارا میں بعض نئے سکول کھل گئے تھے۔ لیکن جونہی ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم چھڑی، امیر بخارا نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور دو سال قبل اس نے بخاری لبرلوں کو جو مراعات دی تھیں، وہ اس نے واپس لے لیں۔ اور علماء کے مطالبے کے سامنے ''سر تسلیم خم'' کرتے ہوئے تمام نئے سکول بند کردیئے۔ ان سکولوں کے بہت سے استاد مشرقی بخارا کی طرف جلاوطن کردیئے گئے۔ اور بعض خاص روس بھاگ گئے۔ لیکن لبرل خیالات اور نئے طریقہ تعلیم کی جڑیں زمین میں جم چکی تھیں۔ اس سے اس کے اثرات بالکل زائل نہ کئے جاسکے، اور نئی روشنی کا عمل برابر جاری رہا۔

دوسرے روسی وسطی ایشیائی صوبوں کی طرح بخارا میں بھی تعلیمی اصلاحات کی تحریک کے بعد سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ ان میں پیش پیش ایک تو بخارا کے دولت مند تاجر خاندان تھے، جو بعد میں امیر بخارا کے خلاف بالشویکوں کے حلیف بنے، دوسرے لبرل تحریک کو دینی مدارس کے محروم و مایوس طالب علموں میں سے بھی استاد اور پروپیگنڈا کرنے والے ملے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کے اکثر لیڈر خود بخارا کے ان دینی مدرسوں کے فارغ التحصیل تھے جہاں کی علم الکلام کی بحثوں کی مشق وتربیت

نے انہیں جدلیاتی اور نظریاتی انداز میں غور وفکر کرنے کے قابل بنادیا تھا۔

عبدالروف فطرت

بخارا کے ان لبرلوں کا مسلمہ نظریاتی لیڈر عبدالروف فطرت تھا۔ بخارا کے دینی مدارس میں تعلیم پانے کے بعد اسے لبرل ''جدیدیین'' کے دولت مند حامیوں نے مزید تعلیم کے لیے قسطنطنیہ بھیجا۔ وہاں اتحاد وترقی کے نوجوان عثمانی ترکوں سے اس کا ربط ضبط ہوا۔ اس کی پہلی کتاب ''مناظرہ'' بخارا کے ''جدیدیین'' کا ایک لحاظ سے منشور بن گئی۔ اس کتاب میں فطرت نے دینی مدارس کے اپنے سابق استادوں پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اسلامی دنیا کو ثقافتی اور ٹیکنیکل ترقی سے علیحدہ رکھ کر اور اس طرح اسے ذہنی وروحانی جمود میں مبتلا کرکے درحقیقت اسلام کی قوت کو نقصان پہنچایا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ''وہ ضرب جو تم نے ہمارے دین پر لگائی ہے، ذرا اس کا خیال کرو۔ تم نے جس غلط طریقے سے شرع محمدی کو پیش کیا، اس سے ہم پر کیا کیا مصیبتیں ٹوٹیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی عظمت کو گہن تمہارے ہی ہاتھوں سے لگا اور تمہاری ہی وجہ سے عنقریب اسلام پورے زوال میں آجائے گا۔ تم نے ترقی میں رکاوٹ بن کر مسلمانوں پر جہالت کا ایک موٹا پردہ ڈال دیا ہے''

فطرت نے مسلمانوں کی فوجی طاقت کی کمزوری کا ذمہ دار بھی علماء اور مدرسوں کے استادوں کو ٹھہرایا۔ وہ لکھتا ہے: ''تم نے ہمارے اس ملک کے لیے اسلحہ کو صرف خنجروں، تلواروں، کمانوں اور تیروں تک محدود کردیا اور ہمیں توپیں، رائفل، بم، ڈائنامیٹ اور دوسرے اسلحہ بنانے سے روک دیا۔ تم نے مسلمانوں کو سنیوں، شیعیوں، زیدیوں اور وہابیوں میں تقسیم کرکے ایک کو دوسرے کا جانی دشمن بنادیا اور تم نے قرآن مجید کو اپنی خوہشات کے تابع کرلیا۔'' فطرت صرف علماء ہی پر نہیں برسا، اس نے امیر بخارا کی بھی خوب خبر لی۔

فطرت اور اس کے ''جدیدی'' ساتھیوں کی تحریروں میں روس کی دشمنی اور پان اسلامزم کی حمایت کے بھی رجحانات ملتے ہیں وہ یورپ کے ہاتھوں عالم اسلام کی تباہی پر غم وغصہ کا اظہار کرتے تھے اور اس کا مجرم اصلاح وترقی کے مخالف علماء اور بخارا کے حکمرانوں کو گردانتے تھے کہ یہ وسط ایشیا کو عیسائیت کے غلبے سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ اسی ضمن میں فطرت یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے جہاد کو فرض قرار دیا تھا، اور یہ کہ نئی تعلیم اور نئے خیالات سے مسلمان اس قابل ہوسکیں گے کہ وہ اسلام کے دفاع اور کفار کے ہاتھوں سے مادر وطن کو آزادی دلانے کے لیے بہتر سے بہتر اسلحہ بنا سکیں۔

عبدالروف فطرت کی ان کوششوں کی وجہ سے بخارا میں بھی سیاسی جدوجہد تیز ہوگئی اور جب نئے امیر نے اپنے وعدے پورے نہ کئے، تو یہ تحریک ''زیرزمین'' چلی گئی اور اس نے نظام حکومت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جہالت، توہمات اور مذہبی تعصب کو ختم کرنے کی کوششوں کا بھی آغاز کردیا۔ بخارا کے ''جدیدیین'' کے عثمانی ترکی کے ''نوجوان ترکوں'' سے بڑے گہرے روابط تھے، اور انہی کی تقلید میں انہوں نے بھی اپنے لیے ''نوجوان بخاری'' کا نام اختیار کیا بخارا سے متصل خیوا تھا وہاں بھی بیسویں صدی کے شروع سے ''جدیدیین'' کے پاوں جم گئے تھے۔ وہاں کے لبرلوں کو اس سلسلے میں خان خیوا کے دومشیروں اسلام خواجہ اور حسین بے سے بڑی مدد ملی۔ خیوا میں بخارا کی طرح نئے سکولوں کا زیادہ چرچا نہ ہوسکا، اور جہاں تک وہاں کی سیاسیات کا تعلق تھا وہ ازبکوں اور ترکمانوں کے باہمی نزاع کا شکار رہی۔

مختصراً مصنف کے الفاظ میں:

> پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس سے کچھ قبل تک وسط ایشیا والوں کی زندگی اور ان کے ذہن پر بدستور اسلام کو غلبہ حاصل رہا۔ نیز ایک طرف اگر زار حکومت کی طرف سے ازبکوں اور تاجکوں کو روسی ثقافت کے رنگ میں رنگنے کی جو بے جوڑ سی کوششیں ہوئیں وہ نسبتاً ناکام رہیں۔ تو دوسری طرف ان کے ہاں ایک لبرل قومی تحریک کے فروغ میں قدامت پسند طاقتیں سدراہ بنیں۔ اس ضمن میں ''جدیدیین'' کو شروع شروع میں جو کامیابی ہوئی، تو وہ زیادہ تر (وولگا اور یورال کے) تاتاریوں کی وجہ سے تھی، اور اس کا دائرہ اثر بھی انہی علاقوں تک محدود رہا، جو روسی نظم ونسق کے تحت تھے جہاں کہ روسی استعمار کے کارندے بالقصد یا بغیر کسی مقصد کے مسلمان مذہبی تشدد پسندوں کے انتقام سے ان لبرل ''جدیدیین'' کو بچاتے تھے۔ لیکن جب بھی اور جہاں بھی وسط ایشیا میں ترقی خواہ (پروگریسو) قومی تحریک کا قدامت پسندوں سے کھلم کھلا مقابلہ ہوا، تو اول الذکر وسط ایشیائی معاشرے کی ہیئت ظاہری اور اس کی روح پر غلبہ پانے میں بہت کمزور ثابت ہوئی اس کے علاوہ وسط ایشیائیوں میں جوئی نئی ترکی قومیت کی لہر ابھری تھی وہ اس بنا پر کوئی واضح شکل اختیار نہ کرسکی، کہ اس کے ذریعہ ترکی قومیت کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصلاح اور اسے زندہ کرنے کی توقعات بھی کی جاتی تھیں۔

روسی آذربائیجان

روسی آذربجان میں، جو بحیرہ کیسپین سے متصل ہے، انیسویں صدی کے دوران ہونے والے ثقافتی و سیاسی تبدیلیوں میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ ایرانی اثر ونفوذ جو وہاں کئی صدیوں سے غالب تھا، ترکیت کی اس سے کش مکش ہوتی ہے۔ قسطنطنیہ میں ترکیت کو ایرانی اثرات سے پاک کرنے کی جو تحریک اٹھی تھی، وہ ترکی کے اندراور باہر دونوں جگہ ترکوں کے قوی احیاء کی ایک مشترک خصوصیت بن گئی۔ اور روس کے تمام ترک علاقوں میں چونکہ آذربائیجان میں ایرانی اثرونفوذ سب سے زیادہ اور قدیم زمانے سے تھا۔ اس لیے روسی آذربائیجان کے لیے اس نئی تحریک کی خاص اہمیت تھی۔ ایران میں صفویوں کے برسراقتدار آنے سے ترکیت اور ایرانیت کی کش مکش نے سنیت اور شیعیت کی شکل اختیار کرلی تھی، چنانچہ ۱۹۱۶ء میں موجود آذربجان کی مسلم آبادی کا ۶۰ فیصد حصہ شیعہ تھا۔

۱۸۰۴ء میں روسی فوجیں ادھر بڑھیں، اور ۱۸۱۳ء کے معاہدہ گلستان کے تحت موجود آذربائیجان روسی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ روسی قبضے کے باوجود ان علاقوں کی نظم ونسق کی زبان ۱۸۴۰ء تک زیادہ تر فارسی رہی۔ مقامی حکام یا تو خود ایرانی تھے، یا وہ ایسے آذربائیجانی اعلیٰ طبقوں میں سے تھے، جو فارسی بولتے تھے۔ اسی طرح ۱۸۷۰ء تک عدالتوں میں فارسی زبان مستعمل ہوتی رہی۔ شیعہ علماء جن کے ہاتھ میں دینی مدارس اور عدالتوں کا کنٹرول تھا، وہ ایرانی اثرونفوذ کے سب سے بڑے محافظ تھے اور اونچے طبقوں اور ادب کی زبان تو فارسی تھی ہی۔

باکو

۱۸۵۹ء میں ایک آذربائیجانی ڈرامہ نویس فتح علی اخوندزادہ نے آذربائیجانی زبان میں ڈرامے لکھے۔ اس نے اپنے اہل وطن کو روسی اور مغربی یورپی ثقافت سے واقفیت پیدا کرنے کی دعوت دی۔ بلکہ اس نے یہ بھی تجویز دی کہ آذربائیجانی زبان عربی رسم الخط کے بجائے روسی لاطینی حروف میں لکھی جائے۔ اخوندزادہ نے شیعہ علماء کے مذہبی تعصب اور تنگ دلی کے خلاف بھی جدوجہد کی، ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول ٹیچر نے آذربائیجانی زبان میں سب سے پہلا اخبار نکالا اس اخبار میں بھی شیعہ علماء کی تنگ دلی اور تعصب کے خلاف لکھا جاتا تھا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب (۱۸۷۰ء۔۱۸۸۳ء) باکو میں تیل کے ذخیرے ملے، اور وہ جلد ایک بین الاقوامی صنعتی مرکز بن گیا۔ ۱۸۸۳ء میں وہاں تک ریل بھی پہنچ گئی۔ اور اب نہ صرف آذربائیجان کی

روسی منڈیوں اور مغربی یورپ سے بلکہ استنبول سے بھی آمدورفت آسان ہوگئی اور اس کے ساتھ ساتھ آذربائیجان میں عثمانی ترکی اثرونفوذ بڑھنے لگا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں آذربائیجان کے اعلیٰ اور تجارت پیشہ طبقوں میں سے ایک پڑھا لکھا گروہ، جو باکو کی نئی زندگی سے متاثر تھا، ابھرنے لگا۔ دانشوروں کے اس نئے گروہ کا رجحان شروع ہی سے پان اسلامزم اور ترکی کی قومیت کی طرف تھا، اسماعیل بے گسپرنسکی کے اخبار ''ترجمان'' نے آذربائیجان کے اندر اسلامی اور ترک دنیا کا ایک حصہ ہونے کا احساس جو ایرانی اور شیعہ بالادستی کی وجہ سے عرصہ دراز سے دبا ہوا تھا، بیدار کردیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں ایک مزاحیہ رسالہ ''ملانصیرالدین'' کے نام سے نکلا جس نے ایرانی اور شیعی روایات کے خلاف پھر اسی جدوجہد کو شروع کیا، جس کی طرح فتح علی اخوندزادہ پہلے ڈال چکا تھا۔

آذربائیجان میں لبرل خیالات اور ترکی کی قومیت کا پہلا داعی علی بے حسین زادہ تھا جس نے باکو اور پیٹرزبرگ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک فعال سیاسی لیڈر بھی تھا اور بااثر اہل قلم بھی وہ ۱۸۸۹ء میں ترکی گیا۔ جہاں نوجوان ترکوں سے اس کے روابط پیدا ہوئے ترکی کے زمانہ قیام میں ترکی سیاسیات میں اس نے عملی حصہ بھی لیا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد وہ واپس باکو آیا، اور وہاں سے ''فیوضات'' نام کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالا، اسی کا ہمعصر ایک اور بڑا ممتاز اور حرکت وقوت سے بھرپور آذربائیجانی احمد بے آغااوغلو تھا، جو پندرہ سال روس سے باہر رہ کر ۱۹۰۵ء میں باکو لوٹا حسین زادہ کی طرح اوغلو کی تعلیم بھی باکو اور پیٹرزبرگ میں ہوئی تھی پھر وہ پیرس چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے مشہور فرانسیسی مورخ ارنسٹ رینان اور بعض دوسرے مستشرقین کی شاگردی کی۔ رینان کے قومی اور سیاسی نظریوں نے جو قومیت کو نسلی شعور پر مبنی قرار دیتے تھے، اس نوجوان آذربائیجانی کے دل و دماغ پر بڑے گہرے اثرات ڈالے اور یہ آگے چل کر نہ صرف تمام ترکوں کو متحد کرنے کا ایک بڑا نقیب وداعی بنا، بلکہ اس نے تمام تورانی نسل کے لوگوں کو متحد کرنے کے لیے ''پان تورانزم'' کا تصور پیش کیا۔ اپنے دور کے دوسرے لبرلوں کی طرح اوغلو نے بھی علماء اور بالخصوص شیعہ علماء کی سخت مخالفت کی اور ان پر الزام لگایا کہ وہ عوام کی جہالت اور توہم پرستی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اس کا کہنا تھا کہ مسلم ممالک کے افلاس کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کی ثقافتی اور تہذیبی سماجی زندگی پر ان علماء کا تسلط ہے آغا اوغلو نے مسلم معاشرے کی اصلاح اور مسلمان عورتوں کی آزادی کی بھی دعوت دی۔

ایک تیسرا شخص جو آذربائیجانیوں کی اس جدوجہد میں بڑا نمایاں تھا، علی بے مردان ہے، یہ

ایڈووکیٹ تھا، اور اس نے ۱۹۰۵ء میں روسی مسلمانوں کی مشہور جماعت ''اتفاق'' کے اجتماع کی صدارت کی تھی۔ وہ دوسری روسی پارلیمنٹ ''ڈوما'' میں مسلم گروپ کا لیڈر بھی رہ چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یورپی تہذیب، مغربی استعمار اور جدید قومیت کے زیر اثر اسلامی دنیا لامحالہ متحد ہوکر رہے گی۔ ۱۹۱۸ء۔۱۹۲۰ء میں جمہوریہ آذربائیجان کی آزادی کے مختصر سے عرصے میں علی بے مردان اپنے ملک کے سب سے فعال سیاسی رہنماؤں میں سے تھا اور بعد میں وہ جمہوریہ آذربائیجان کا صدر بھی بنا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے وقفے میں جب کہ روس میں قدرے آزادی تھی۔ آذربائیجان میں کافی اخبارات نکلے۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ ضیا، کشکول، ضیائے قفقاز، صدا، صدائے وطن، صدائے حق، صدائے قفقاز، حقیقت، اینی (جدید) حکمت، اقبال، معلومات، میزان، اور تجارت وغیرہ۔

روس کے تمام ترک علاقوں میں آذربائیجان ہی میں سب سے پہلے مسلمان عورتوں کو مساوی حقوق دینے کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ ایک خاتون خدیجہ خانم نے ''عشق'' نام کا رسالہ نکالا، اسی طرح بعض اور ممتاز خواتین اس جدوجہد میں پیش پیش تھیں۔ سوائے مذہبی اخبارات کے، باقی تمام آذربائیجانی صحافت نے مسلمان عورتوں کی آزادی کی اس تحریک کی تائید کی تھی۔

باکو میں تیل کے ذخیروں کی وجہ سے آذربائیجان میں دوسری قوموں کے لوگ بھی آگئے تھے۔ اور پھر مزدور تحریک بھی وہاں تھی۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سوشل ڈیموکریٹس کا اثر ونفوذ مزدور تحریک میں سرایت کر چکا تھا۔ اور اسی زمانے میں اسٹالن باکو میں اپنی انقلابی سرگرمیوں میں سرگرم کار تھا۔ ۱۹۰۴ء میں سوشل ڈیموکریٹس نے ''ہمت'' کے نام سے ایک مخصوص مسلمان گروپ کی تشکیل کی، جس کے لیڈر آذربائیجانی تھے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد ان میں سے ایک عزیز بے کوف باکو میں بالشویک سربراہ بنا، اور انہی نے کاکیشیا کے علاقوں میں سویت نظام کے نفاذ میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ آذربائیجان کے دانشوروں کے ایک گروہ کی ہمدردیاں استنبول کے ساتھ تھیں۔ اور جب ترکی میں اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک برسراقتدار آئے تو آذربائیجان میں پان ترکیت کا پروپیگنڈہ کافی تیز ہوگیا۔

مساوات پارٹی

باقاعدہ طور پر پہلی آذربائیجانی سیاسی پارٹی کہیں ۱۹۱۱ء۔۱۹۱۲ء میں بن پائی۔ محمود امین بے رسول زادہ کی قیادت میں چند دانشور جمع ہوئے اور انہوں نے ''مساوات'' کے نام سے ایک زیر زمین (انڈرگراونڈ) بائیں بازو کی بوژوا پارٹی کی بنا رکھی۔ احمد بے آغا اوغلو اور دوسرے بہت سے آذربائیجانوں

کی طرح رسول زادہ اپنی سیاسی زندگی کے شروع میں ترک نیشنلسٹ سے زیادہ اتحاد اسلامی کا حامی ایک لبرل تھا۔ بعد میں اسٹالن کے ساتھ مل کر اس نے مسلمانوں کا ایک سوشل ڈیموکریٹ گروپ ''ہمت'' کے نام سے بنایا۔ باکو میں وہ روس کی زار حکومت کی مخالفانہ سرگرمیوں میں بھی شریک رہا۔ اس کے بعد وہ بھاگ کر ایران چلا گیا۔ اور وہاں اس نے شاہ ایران کی استبدادی حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لیا۔ جب ایران انقلاب ناکام ہوا تو وہ جان بچا کر استنبول پہنچ گیا۔ اور وہاں وہ نوجوان ترکوں میں جو برسراقتدار آچکے تھے، شامل ہوگیا۔ رسول زادہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں کا مسلمہ ادیب تھا۔ چنانچہ ایران میں وہ ایرانی اخبارات میں مضمون نگاری کرتا رہا۔ اور استنبول میں ایک انتہا پسند ترکی قوم پرست اخبار میں جسے اس کے باکو کے اپنے ہم وطن اور رفیق کار احمد بے آغااوغلو نے جاری کیا تھا، لکھنے لگا۔ ۱۹۱۰ء۔۱۹۱۱ء میں واپس باکو آیا، اور آتے ہی اس نے مقامی سیاسات میں بڑی مستعدی سے حصہ لینا شروع کردیا۔

''مساوات'' باوجود اپنے نام کے اور باوصف اس کے کہ اس کے قائم کرنے والے پہلے سوشل ڈیموکریٹس رہ چکے تھے۔ ایک سوشلسٹ پارٹی سے کہیں زیادہ ایک قوم پرست ترک یا پان اسلامزم کی حامی پارٹی تھی، پارٹی کے قیام کے وقت اس کا جو منشور شائع کیا گیا، اس میں ''مساوات'' کی مرکزی کمیٹی نے اس دور کا ذکر کیا تھا جب کہ صاحب اقبال مسلمانوں کا ایک ہاتھ پیکنگ کو چھو رہا تھا۔۔۔اور دوسرے ہاتھ سے انہوں نے یورپ کے دوسرے سرے پر الحمرا کو وجود بخشا تھا۔ اس منشور میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ ''ایشیا، افریقہ اور یورپ کے اتنے وسیع وعریض ملکوں پر حکمرانی کرنے کے بعد آج اسلام کے حصے بخرے ہوگئے ہیں''۔ ''مساوات'' کے پروگرام کی بنیادی باتوں میں مساوات وبرابری سے زیادہ مسلمانوں کو جن سے کہ ان کی مراد لامحالہ ترک تھے، متحد کرنے کا مسئلہ تھا، ''مساوات'' کے پروگرام کی بعض دفعات یہ ہیں:

۱۔ تمام مسلمانوں کو بلاتمیز فرقہ وقوم متحد کرنا

۲۔ جو مسلمان ممالک غلام ہیں، ان کی آزادی کو بحال کرنا

۳۔ جو مسلمان ملک اپنی آزادی کی حفاظت یا اپنی آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کررہے ہیں ان کی اخلاقی و مادی مدد کرنا۔

۴۔ مسلمان اقوام کا ان کی دفاعی اور اقدامی طاقت کو مضبوط بنانے میں ہاتھ بٹانا

۵۔ ان خیالات کی نشرواشاعت کی راہ میں جو بھی رکاوٹیں حائل ہوں، انہیں دور کرنا

۶۔وہ جماعتیں جو مسلمانوں کے اتحاد و ترقی میں کوشاں ہیں، ان سے ربط قائم کرنا
۷۔وہ غیر ملکی پارٹیاں جو انسانیت کی بہبود اور ترقی کے لیے کام کررہی ہیں، حسب ضرورت ان سے روابط قائم کرنا۔اور ان سے تبادلہ خیالات کرنا
۸۔مسلمانوں کی بقاو حفاظت اور ان کی تجارت ، صنعتی اور معاشی ترقی کی جدوجہد کے تمام وسائل کو تقویت دینا۔

جیسا کہ ظاہر ہے ''مساوات'' کا یہ منشور ار پروگرام ایک معجون مرکب تھا قوم پرستانہ اور مذہبی اور سماجی نعروں کا ، اور اسی وجہ سے یہ غیرواضح اور مبہم رہا۔ اور عملاً یہ جماعت آذربائیجان کی سیاسیات میں زیادہ مثبت کروار انجام نہ دے سکی۔

اگرچہ ''مساوات'' بہت جلد آذربائیجان کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی ،لیکن ملک میں متعدد ایسے گروہ بھی تھے ، جو اس کے مخالف تھے۔ ایک تو شیعہ علماء جو صدیوں سے ایران کے ساتھ وابستہ تھے، وہ ''مساوات'' کی سنی ترکی سے اس بڑھتی ہوئی ہمدردی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ دوسرے ملاّ اور قدامت پسند مسلمان عوام اس جارحانہ سیکولرزم کو جو مسلم ترکی سلطنت کے حامیوں میں پائی جاتی تھی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے علاوہ خود ''مساوات'' والوں کے حلقوں میں یورپی فیشنوں کا فروغ متناقض تھا اس روائیتی تصور کے ، جو مسلمانوں میں عام طور سے عائلی زندگی اور عورتوں کے بارے میں تھا۔ وہ عورتوں کی برابری اور آزادی جیسی چیزوں کو بڑا خطرناک سمجھتے تھے۔ پھر نئے طورطریقوں اور یورپی ادب و آرٹ کی کشش، تھیٹروں کی ہردلعزیزی، جس کی وجہ سے نمازیوں کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی اور عربی اور فارسی کلاسیکی کتابوں کے بجائے فرانسیسی اور جدید ترکی ادب کا مطالعہ۔ ان سب چیزوں کا اثر پرانے مسلم معاشرے پر پڑرہا تھا۔ پگڑیوں کی جگہ ہیٹ کا رواج ہورہا تھا۔ نئے قسم کے فرنیچر اور تصویروں سے مسلمان گھروں کی ہیئت بدل رہی تھی۔اور روسی اور فرانسیسی یا ترکی خیالات کے زیراثر مذہبی تصورات ختم ہوتے جارہے تھے۔ اب حالت یہ تھی کہ ''مساوات'' سے تعلق رکھنے والے لبرل دانشوروں کے ان دعووں کے باوجود، جو انہوں نے اسلام کے شاندار مستقبل کے بارے میں کئے تھے، علماء یہ دیکھ رہے تھے کہ ان لوگوں کی تجدیدی بدعات کی وجہ سے پرانا نظام اور روایات ختم ہورہی ہیں۔ مزید براں پرانے نظام کے حامیوں کے لیے ، جو مذہبی عالمگیریت کی روح اور اسلام کے بین الاقوامی اور ہمہ گیریت کے عقیدے کے جو قومی حدبندیوں سے بالاتر ہے، حامل تھے۔ ''پان ترکزم'' کے تنگ دلانہ نسلی نظریے

بڑے تشویشناک تھے۔ بسااوقات دونوں گروہوں کی یہ مخالفت کھلی دشمنی کی صورت اختیار کرلیتی، جس کے نتیجے میں علماء وملاّ ان لبرلوں کو زندیق وملحد قرار دیتے۔

جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) کے دوران اور اشتراکی انقلاب کے موقع پر ''مساوات'' کے بعض حامی آذربائیجان کی سیاست کے بائیں بازو میں چلے گئے۔ سوشل ڈیموکریٹس کا گروہ ''ہمت'' جس سے پہلے رسول زادہ اور اس کے بہت سے متبع متعلق تھے، آذربائیجانی مزدوروں میں ''مساوات'' سے زیادہ ہر دلعزیز تھا۔ اور پھر سوشل ڈیموکریٹس کے مانشویک اور بالشویک میں تقسیم ہونے کے باوجود ''ہمت'' میں کوئی تفرقہ نہیں ہوا تھا۔

روسی سلطنت کے دوسرے حصوں کی طرح ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصے میں تیز رفتار معاشی اور تعلیمی ترقی نے آذربائیجانی سماجی لیڈروں کی توجہ خالصتاً سیاسی مسائل سے ہٹا دی تھی، یہاں تک کہ جب پہلی جنگ عظیم میں ترکی روس کے مخالفین کے ساتھ شامل ہوگیا، تو کاکیشیا کے ان علاقوں میں بظاہر جوامن وسکون تھا، اس میں کوئی فرق نہ پڑا۔

پان ترکزم کا فروغ

۱۹۰۷ء کے بعد روسی حکومت نے ''ڈوما'' میں ترک نمائندوں کی نشستیں کم کردیں اور بقول مصنف، اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ روس کے کیڈٹس اور مزدور گروپ مسلمانوں کے تیں ارکان ڈوما سے محروم ہوجائیں۔ اور دوسرے بڑھتی ہوئی مسلم یا دوسرے لفظوں میں ترک قوم پرست تحریک کے وقار کو کاری ضرب پڑے۔ بات یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۷ء کے درمیانی عرصے میں ترکوں کی روزافزوں سیاسی سرگرمیوں نے روسی حکومت کو خوفزدہ کردیا تھا۔ اور یہ ظاہر تھا کہ یورال اورووالگا کے تاتاری روس کی تمام ترک اقوام یعنی تمام مسلمانوں کو متحد کرکے ان کی قیادت حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کررہے تھے۔ تاتاریوں کے مدارس، اخبارات اور ان کی کوششوں سے روسی مسلمانوں کی جو کانفرنسیں ہوئیں، ان کی کامیابی نے یہ ثابت کردیا تھا کہ تاتار اب ایک قابل ذکر قوت ہیں، اور یہ کہ ان کی سیاست کا رخ ترکی کی طرف ہے۔

سیاسی سرگرمیوں کی راہ اس طرح مسدود پاکر ۱۹۰۸ء۔۱۹۱۰ء میں بہت سے روسی ترکی لیڈر ترک چلے گئے۔ اور استنبول ایک بارپھر روس کے پان ترکزم کے حامیوں کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۰۸ء میں اتحاد ترقی کے نوجوان ترک ترکی میں برسراقتدار آگئے۔ سلطان عبدالحمید کی پان اسلامزم کی پالیسی کے

برخلاف وہ ترکوں کے اتحاد کے حامی تھے۔اسی زمانے میں ترکی زبان اور ترکوں کی زندگی کو تمام مضرت بخش غیر ترکی عناصر سے پاک کرنے کی مہم کا آغاز کیا گیا۔ اور ترکی کی انجمن اتحاد و ترقی کی مرکزی کمیٹی تین مشہور ترک قوم پرست لیڈروں اسماعیل بے گسپرنسکی (کریمیا) علی بے حسین زادہ (آذربائیجانی) اور یوسف اکچورن (تاتار) کو ارکان منتخب کیا گیا۔ اور ایک آذربائیجانی احمد بے آغا اوگلو قسطنطنیہ کے تمام تعلیمی اداروں کے جنرل انسپکٹر مقرر ہوئے، غرض پہلی جنگ عظیم سے قبل کے پانچ چھ سالوں میں قسطنطنیہ پان ترکزم کے پروپیگنڈے اور اس سے آنے والے ترکوں کی قوتوں کو یکجا و مستحکم کرنے کا مرکز بن گیا۔

۷/دسمبر ۱۹۱۱ء کو یوسف اکچورن کا اخبار ترک یوردو (ترک بابائے وطن) جو پان ترکزم کا علم بردار تھا، نکلنا شروع ہوا۔ اور یہ اتنا کامیاب رہا کہ اسکے پہلے شمارے کے چار ایڈیشن، دوسرے کے تین اور تیسرے کے دو ایڈیشن نکلے۔ اس اخبار کے تقریباً ہر شمارے میں ''پان ترکزم'' کی آئیڈیالوجی کا بانی اور اس کے نظریاتی ماہر احمد بے آغا اوگلو لکھتا۔ گو آوگلو اور اکچورن دونوں گسپرنسکی کے دور سے زیادہ قریب تھے۔ لیکن اسلام اور اس کی ثقافت کے بجائے اب ترکیت اور تورانیت تھی جو ''ترک یورود'' کے بانیوں کے لیے محرک جذبہ تھا۔ اوگلو اپنے مضامین میں دنیا کی تاریخ و تہذیب میں ترکوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، ان کا ذکر کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر سات آٹھ کروڑ تورانی (ان میں وہ ترکوں کے ساتھ ساتھ ایشیا اور یورپ کے منگولوں اور فن لینڈ والوں کو بھی شامل کرتا تھا) متحد ہو جائیں، تو وہ ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر سکتے ہیں۔ وہ اسی پر زور دعوت دیتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاپانیوں کو چھوڑ کر تمام ایشیائی قوموں میں سب سے ترقی یافتہ اور ثقافت میں سب سے آگے ترک قومیں ہیں۔''

اس پان تورانزم کے داعی اور بھی بہت سے تھے، اور تورانیت کے گن گانے میں وہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ پان تورانی عرب اور عثمانی خلافت کو نظر انداز کر کے تورانی (ترکی و منگولی) ماضی سے فیضیان روحانی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے تاریخی ہیرو اٹیلا، اگوز خاں، چنگیز خاں اور تیمور تھے اور انہی کی اساس پر وہ اپنی تورانیت کا ایک تاریخی اور قومی افسانوی ڈھانچہ تیار کرنے میں کوشاں نظر آتے تھے۔ ہُنوں اور منگولوں کی شاندار سلطنت کی یادیں جو کسی زمانے میں بحیرہ جاپان سے بحیرہ روم تک اور ہندوستان کے میدانوں سے شمالی روس تک پھیلی ہوئی تھی، ان کے لیے غیر معمولی کشش رکھتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء۔۱۹۱۸ء کے درمیانی عرصے میں ان نوجوان ترکوں کے لیے ایک ایسی ہی ترک منگولی تورانی سلطنت کا ازسرنو قیام اور ایک نئی تورانی مملکت کی تخلیق، جو تمام

ترکوں، منگولوں، یہاں تک کے فن لینڈ والوں پر مشتمل ہو، اور اس میں چنگیز خاں اور اٹیلا کے خانہ بدوش قبائل کے تمام علاقے شامل ہوں، جنوں کی حد تک ایک ذہنی امنگ سی بن گئی۔

پان ترکزم کی یہ سیاسی ایجی ٹیشن پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ محب الوطن ترک اخبار نویس یہ سمجھنے لگے کہ بس اب روس ختم ہوجائے گا۔ اور اس کی جگہ تورانی سلطنت لے لے گی، لیکن جہاں تک اخبار ''ترک یورود'' کے گروپ کا تعلق تھا اس نے کھلم کھلا روس دشمن پروپیگنڈے سے اجتناب کیا۔ اور روسی حکومت نے بھی ملک میں اس کا داخلہ بند نہیں کیا۔

مختصراً حکومت زار کے آخری سالوں میں روسی و ترکی تعلقات کی عام طور پر کیفیت یہ تھی کہ روسیوں اور ترکوں کی باہمی مخالفت کی چند ایک مثالوں کے باوجود، صورت حال ایک حد تک اچھی ہی تھی، اور دونوں قومیں بالخصوص روسی اور تاتاری ایک دوسرے کی ضرورت اور افادیت کو سمجھنے لگی تھیں۔ جنگ عظیم سے ذرا پہلے تاتاری سماجی اور ثقافتی لحاظ سے کافی آگے تھے اور ۱۹۱۷ء میں مسلمانوں کے مدنی (سول) حقوق روسیوں کے برابر تھے۔ ۱۹۱۲ء میں ترکی زبانوں کے مدارس کی تعداد پچیس ہزار تک پہنچ چکی تھی اور اسی سال کوئی ۶۰۸ کتابیں ''اسلامی زبانوں'' میں چھپیں، جن میں صرف چار میں سنسر کی زیر ہدایت کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ یورال وولگا کے تاتاریوں کا شہر قازان روس میں ترکی مطبوعات کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اور ۱۹۱۲ء میں کوئی ۴۶۶ کتابیں ۳۲ لاکھ کی تعداد میں وہاں سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ روس کے طول و عرض سے درجنوں ترکی رسالے اور اخبار نکلنے لگے دور دراز شہروں میں مسلم سوسائٹیاں اور مساجد بنیں۔ زار کی افواج میں کئی مسلمان جنرل روسی جنرلوں کے ہم پایہ تھے اور اسی طرح متعدد تجارتی و صنعتی مسلمان اداروں کا شمار ملک کے دولت مند ترین اداروں میں ہوتا تھا۔

یہ ایک اجمالی نقشہ تھا، سلطنت زار روس کے مسلمان ترکوں کا، جب ۱۹۱۴ میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا، دوسرے اہل ملک کی طرح روسی ترکوں نے بھی بالعموم حکومت کی تائید کا اعلان کیا۔ اور مالی امداد پیش کرنے کے علاوہ وہ فوج میں بھی بھرتی ہونے لگے۔ لیکن اس میں ظاہر ہے، کچھ مستثنیات بھی تھیں۔ روسی پولیس کے ۱۹۱۴ء۔۱۹۱۶ء کے ریکارڈ بتاتے ہیں کہ شمال میں کریمیا سے لے کر جنوب میں خیوا اور فرغانہ تک کہیں کہیں ترکی سے ہمدردی کا اندر اندر پروپیگنڈہ ہوتا رہا۔ جہاں تک استنبول میں پناہ گزیں روسی ترک لیڈروں کا تعلق تھا، وہ جنگ کے دوران بڑی مستعدی سے روس کے خلاف برسرکار رہے ان کے وفد اسٹریا، ہنگری اور جرمنی کے وزراء سے ملے۔ اور روس کے مقبوضہ ترک علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے ان سے مدد چاہی۔ لیکن وہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود روسی ترکوں کو حکومت روس

کے خلاف نہ اٹھا سکے۔ البتہ جب روسی حکومت نے وسط ایشیا کے مسلمانوں کو جبراً فوج میں بھرتی کرنے کی کوشش کی تو کرغیز یا میں عام بغاوت ہوگئی، جہاں کافی کشت وخون ہوا اور کوئی تین لاکھ کرغیزی چین کے مقبوضہ حصہ کی طرف چلے گئے۔ اس ہنگامے میں دوہزار کے قریب روسی آباد کار مارے گئے تھے۔ غرض جنگ عظیم کے دوران روس کے کسی بھی ترک علاقے میں آزادی کے لیے باقاعدہ طور پر حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہوا۔اور بالعموم حالات معمول پر رہے۔

انقلاب فروری ۱۹۱۷ء

جب روس میں ۱۹۱۷ء کا انقلاب ہوا تو ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک نئی آزاد جمہوری زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مصنف کے الفاظ میں ''اس سے قبل مشرقی یورپ کی تاریخ میں کبھی اتنی تقریریں، اعلانات اور درخواستیں نہیں کی گئیں اور لکھی گئیں، جتنی کہ فروری ۱۹۱۷ء سے لے کر نومبر ۱۹۱۷ء تک کے ان افراتفری کے آٹھ مہینوں میں۔'' روس کے دوسرے قومی گروہوں کی طرح مسلمان لیڈر بھی نومولود جمہوریت کی ڈیموکریٹک تشکیل نو کی تائید میں تھے۔ اور اس کے اندروہ روس کے تمام مسلمانوں کی وحدت اور باہمی تعاون کا تصور کررہے تھے۔لیکن جب ۱۹۱۷ء میں خالص سیاسی اور قومی مقاصد کو مذہبی نعروں میں چھپا کر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی تھی تو اس وقت بھی روسی ترکوں اور ان کی طرح دوسرے غیر ترک مسلمانوں کو پہلے کی طرح باہم متحد رکھنے والی چیز صرف مذہب اسلام اور اس کی ثقافت تھی اور کسی قومی اور نسلی پروگرام سے کہیں زیادہ موثر اور طاقت ور اسلام ہی کا رشتہ ثابت ہوا۔

روسی تاریخ کے اس نازک ترین موڑ پر ''مسلم سیاسی محاذ'' کئی گروہوں میں بٹ گیا۔ انتہائی دائیں بازو میں علماء اور قدامت پسند تھے، جن کا شمالی کاکیشیا اور وسط ایشیا میں اب بھی کافی زور تھا۔ بیچ میں سابق ''اتفاق'' پارٹی کے اعتدال پسند بوژوازی لبرل تھے۔ جنہوں نے ''اتحاد'' کے نام سے اپنی نئی تنظیم قائم کی تھی۔ بائیں بازو میں بڑی سرعت سے سوشلسٹ گروپ وجود میں آگیا، جس کا سب سے ہردلعزیز گروہ ''مسلم برانڈ'' کے سوشلسٹ انقلابیوں کا تھا۔ جو مزدوروں کے مسائل سے زیادہ قومی اور زرعی مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اور انتہائی بائیں بازو میں بین الاقوامی مانشویک اور بالشویک گروپ بن رہا تھا، لیکن ۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں یہ بہت کمزور تھے۔

''مسلم سیاسی محاذ'' ایک تو یوں بٹ گیا۔ اور دوسری طرف ان میں یہ اختلاف بھی تھا کہ ان کے سرحدی علاقے تو جیسے کہ کاکیشیا، کریمیا، تاتارستان، بشکیریا، اور وسط ایشیا کے خطے تھے، قومی علاقائی

خود مختاری پر زور دیتے تھے، لیکن دوسری طرف وولگا یورال کے تاتاری اس کے بجائے تمام روسی مسلمانوں کے لیے ثقافتی خود مختاری کا اصول پیش کرتے تھے جس کا کہ ایک مرکزی نظام ہو۔

فروری ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روسی مسلمانوں کی پہلی کانگریس مئی ۱۹۱۷ء میں ماسکو میں ہوئی ، جس میں نوسوڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اس میں ہر خیال کے نمائندے تھے۔ اور ہر ایک نے کانگریس میں اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا تھا بقول مصنف کے: ''اس کانگریس کے نتیجے میں جو آل روسی مسلم کونسل وجود میں آئی ، وہ باہمی جھگڑوں کا اڈا بن گئی۔ روس کے دوسرے لوگوں کی طرح روسی مسلمان بھی ۱۹۱۷ء میں غیر حقیقت پسندانہ سیاسی تصورات کے عارضے کا شکار ہوگئے۔ سب کے سب آزادی اور مساوات چاہتے تھے، اور اس معاملے میں وہ اتنا آگے چلے گئے کہ ان کے ہاتھ سے سماج اور مملکت کی تشکیل کے تمام حقیقی مواقع جاتے رہے۔ جمہوری انفرادیت پسندی انار کی اور مزاج میں بدل گئی۔ اصولوں یا شخصیات کی اطاعت کا کوئی خیال نہ رہا۔ آزادی کی محبت کے معنی تمام ذمہ داریوں اور سماجی اور ریاستی پابندیوں کا انکار ہوگیا۔''

اشتراکی انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء

۲۶/اکتوبر ۱۹۱۷ء کو پیٹرزبرگ میں لینن اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا۔

اس بالشویک انقلاب کے بارے میں روسی مسلمانوں کا رویہ تمام تر معاندانہ نہیں تھا گو بہت تھوڑے سے تعلیم یافتہ تاتاری اور آذربائیجانی ہی مارکس اور لینن کے نظریات سے واقف تھے۔ لیکن بعض مسلمان سیاست داں بالشویکوں کے قومیتوں کی خودمختاری کے متعلق جو تصورات تھے، ان کی وجہ سے وہ ان کے حامی تھے۔

پہلی سوویت حکومت بنتے ہی لینن اور اس کے رفقاء نے قومیتوں کے مسئلے کی طرف خصوصی توجہ کی ۔اور اسٹالن جو خود سلاو نہیں تھا، اس شعبے کا سربراہ بنایا گیا۔ ۲۰/نومبر ۱۹۱۷ء کو اسٹالن کے ایما پر حکومت نے ''روس اور مشرق کے تمام مسلمان محنت کشوں کے نام ایک منشور جاری کیا۔ ، جس میں مسلمان ''کامریڈوں اور بھائیوں'' کو مخاطب کیا گیا تھا۔ یہ بالشویکوں کی سیاسی چال کا ایک شاہ کار تھا۔ اور اس میں مارکس اور لینن کی تعلیمات کے تمام مذہب دشمن اور بین الاقوامی عناصر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مذہبی و قومی جذبات سے اپیل کی گئی تھی۔ اس منشور کے کچھ اقتباسات یہ ہیں۔

''۔۔۔روس، کرغیز، وسط ایشیا اور سائبیریا کے مسلمانو! کا کیشیا اور ماورائے

کاکیشیا کے ترکواور تاتاریو! وہ سب جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں مسمار کی گئیں اور جن کے عقائد اور روایات کو زاروں اور روس کے مستبدوں نے پاوں تلے روندا۔ آج سے تمہاری روایات وعقیدے، تمہارے قومی اور ثقافتی ادارے آزاداور مداخلت سے محفوظ ہیں۔ تم آزادی سے اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی قومی زندگی کی تنظیم کرو۔ تمہارے حقوق جیسے کہ روس کے دوسرے لوگوں کے حقوق ہیں، آج سے انقلاب کی پوری قوت اور اس کے دست وبازومزدوروں کی سوویتوں، فوجیوں، اور کسانوں کی حفاظت میں ہیں۔ اس انقلاب کی پشت و پناہ بنو۔ یہ تمہاری خود اپنی حکومت ہے۔ مشرق کے مسلمانو! ایرانیو! ترکو! عربو! ہندوستانیو! اے سب لوگو! جن کی زندگیاں ، جائدادیں، وطن اور آزادیاں یورپ کے لٹیروں کے رحم پر تھیں، جن کی زمینیں ان ڈاکوؤں نے چھین لی تھیں، اور جنہوں نے اس جنگ کو شروع کیا تھا۔ ہمارے جھنڈے دنیا کے مظلوم اور پسے ہوئے لوگوں کے لیے آزادی کا نشان ہیں''۔

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ اعلانات محض خالی خولی الفاظ نہیں ہیں، اسٹالن نے قران مجید کا ایک پرانا نسخہ جو حضرت عثمانؓ سے منسوب تھا، پیٹروگریڈ کی شاہی لائبریری سے نکلوا کر مسلمانوں کے حوالے کردیا۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں تاتاریوں کے بعض تاریخی آثار قدیمہ مقامی قومی کمیٹیوں کے سپرد کئے گئے اور اسلامی امور کے لیے تاتاری علاقے میں ایک خصوصی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ جس کا چیرمین ایک تجربہ کار سوشل ڈیموکریٹ اور پرجوش انقلابی ملا نوروا ہتوف تھا۔ اس کمیٹی کے متعدد اور ارکان بھی تھے غرض مصنف کے الفاظ میں ۔

سوویت حکومت کے ان اقدامات اوران کے ساتھ ساتھ بڑی ہوشیاری سے جو پروپیگنڈا کیا گیا اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں اپنی قسم کی ایک نرالی تحریک ابھری ، جس میں اسلام اور مارکسزم ایک دوسرے سے مخلوط تھے۔ یہ تحریک سوویت شریعت والوں کی تھی (یعنی وہ سوویت والے جو شریعت اسلامی کے حامی ہیں) ان کا لیڈر ایک داغستانی تارکوحاجی تھا۔ چیچنوں میں ایک ملا سلطان۔ اور کباردینا میں کاٹ خونوف تھا رسولوف نے وولگا یورال کے تاتاریوں میں سوویت شریعت والوں کے پروپیگنڈے کی مہم چلائی ۔

سوویت حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد روسی سلطنت کے مختلف علاقوں میں خودمختاری کی تحریک زور پکڑگئی تھی۔ چنانچہ فن لینڈ، لیتھونیا، استونیا اور یوکرین وغیرہ نے فرداً فرداً مستقل مملکت ہونے کا اعلان کردیا۔ ''نہ صرف ان قومی گروہوں نے بلکہ خالص روسی رقبوں یا ان خطوں نے جن میں مخلوط آبادی تھی، بلکہ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے اضلاع ، یہاں تک کہ دیہات نے حق خود اختیاری کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑی سرعت سے کام لیا، تاکہ اس طرح وہ سوویت کنٹرول سے محفوظ رہیں۔

قومی خودمختاری کی جدوجہد

انہی لوگوں میں مسلمان بھی تھے،جنہوں نے اپنی قومی خود مختاریوں کا اعلان کرنے کی طرف قدم اٹھائے۔لیکن ان میں سے اکثر آزاد خود مختار ریاستیں زیادہ دیرتک قائم نہ رہیں۔ اور سوویت حکومت نے ''پرولتاری انقلاب کے مفاد'' کے پیش نظر اس حق خوداختیاری کو معطل کردیا۔ وولگا یورال کے تاتاری مسلمان روسی ترکوں میں سب سے زیادہ بااثر تھے، اور ان کی جو خودمختار ریاست بنی، وہ کافی مضبوط تھی۔ لیکن تاتاری قوم پرست اپنے متصل بشکیری ترکوں کے علاقوں کو بھی اس ریاست میں رکھنا چاہتے تھے، جس سے دونوں میں اختلاف ہوا، اور سوویت حکومت نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یہ تاتاری ریاست ختم کردی گئی۔ اور اس کی جگہ سٹالن کی زیرہدایت ایک تاتاری بشکیری جمہوریہ تشکیل ہوئی۔ جس سے تاتاری کمیونسٹ بہت خوش ہوے۔ ان تاتاری کمیونسٹوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:

> ''یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مسلم کمیونسٹ اپنے آپ کو مارکسٹ، انٹرنیشنلسٹ اور پرولتاری سے جو اصل مراد ہے، وہ محسوس کرتے تھے۔ بے شک انقلاب سے ان کی وفاداری صدق دلانہ تھی۔ بلکہ وہ سب سے پہلے اسے یورپی آبادکاروں کے اوپر مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق کی فتح سمجھتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ایک تاتاری مصنف نے ملا نوروا ہتوف کے حالات میں جو اسٹالن کا پہلا مسلمان رفیق کار تھا۔ (بعد میں وہ انقلاب دشمن روسیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا) لکھا ہے۔ ''ملا نور کو یقین تھا کہ عالمگیر سوشلسٹ تعمیر نو کے نتیجے میں عالمی ثقافت پر قدیم عرب ثقافت کا زبردست اثر پڑیگا وہ اس اسلامی ثقافت کے خواب دیکھتا تھا، جس کا اثر ونفوذ سرزمین عرب سے مقدس دریا گنگا تک پھیلے گا ، اور وہ اپنی معنویت کے اعتبار سے عظیم بڑی حسین اور عمیق ہوگی۔ وہ اس کا تصور بھی

نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا زوال اور خاتمہ ممکن ہے۔ وہ یہ خواب دیکھتا تھا کہ مستقبل میں یہی ثقافت تمام انسانیت کو منور کرے گی۔ اور اسے ان باتوں کا یقین تھا۔''

ملانور کے نزدیک جیسا کہ اس نے ۷/مارچ ۱۹۱۷ء کو قازان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تاتاری انقلاب کا یہ تجربہ حرف آغاز ہے پورے مشرق کی عام سیاسی بیداری کا، اس کا کمیونسٹ نائب مشہور تاتاری ناولسٹ اور ماہر علم اللسان گلیم جان بھی مشرق اور اسلام سے اسی طرح روحانی طور پر وابستہ تھا۔ ایک اور تاتاری کمیونسٹ سلطان گالیف نے اپنے ایک سلسلہ مضامین میں لکھا کہ تاتاری کمیونسٹ ''مشرق اور اسلام کے سچے انقلابی ہیں'' اور ان کے لیے مقدم ترین سوال عالمی انقلاب کا نہیں بلکہ ''یورپی استحصال پسندی'' کی زنجیروں سے مشرق کو آزاد کرانا ہے۔

اسٹالن، جس نے اس زمانے میں ان تقریروں اور تحریروں کی حوصلہ افزائی کی تھی، اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلم کمیونسٹوں کی آئیڈیالوجی اور مقاصد یورپی کمیونسٹوں سے بہت زیادہ مختلف ہیں، لیکن ۱۹۱۸ء کے نازک دنوں میں بالشویکوں کو جہاں سے بھی مدد ملتی تھی وہ اسے قبول کرلیتے تھے۔ وہ ہر اس شخص کو حلیف بنانے کے لیے تیار تھے، جو بین الاقوامی انقلاب کا حامی ہوتا، اور وہ سفید روسی افواج اور سابق کمیونسٹ دشمن قوم پرست روس کے آخری نمائندوں سے لڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے بائیں بازو والوں کی مخالفت نیز خود اپنے ان تاتاری حلیفوں پر عدم اعتماد کے باوجود اسٹالن نے ہر طرح سے ان کی مدد کی۔

۱۰۔۱۶/مئی ۱۹۱۸ء کو اسٹالن نے مسلم کمیونسٹوں کی ایک کانفرنس بلائی، اس میں خود افتتاحی تقریر کی اور اس طرح تقریباً ایک کروڑ آبادی پر مشتمل ایک تاتاری بشکیری خود مختار جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس پر ملا نور نے بڑے خلوص سے ان جذبات کا اظہار کیا:

''ہم کامریڈ لینن اور اسٹالن کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے یہ سمجھا ۔۔۔مسلم پرولتاری کی آرزوں کی تکمیل ایک شاندار انقلابی کارنامہ ہے۔''

اس کانفرنس سے چند دن ہی بعد پورے مشرقی روس میں خانہ جنگی (سول وار) شروع ہوگئی اس سلسلے میں ''مسلم مزدوروں'' اور ''کسانوں'' کی سوویت مسلم افواج بنائی گئی اور ملا نور نے اپیل کرتے ہوئے لکھا کہ'' اس خطرے کے وقت مسلم پرولتاریہ و سوویت جمہوریہ کے دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے'' اسی کشمکش میں ملا نور ۱۹/اگست ۱۹۱۸ کو مارا گیا۔

ترک قومیتوں میں کشمکش

۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل بشکیریوں اور تاتاریوں میں کوئی خاص مخاصمت نہیں تھی، لیکن انقلاب کے بعد بشکیری لیڈروں نے بھی اپنی ایک مخصوص قسم کی قومیت کا مظاہرہ کرنا شروع کردیا ان کا سب سے بڑا مسئلہ زمین کا تھا، اور وہ ان تمام آبادکاروں کے خلاف تھے اپنے مسلمان تاتاری بھائیوں سمیت، جو باہر سے آکر ان کی زمینوں پر آباد ہوگئے تھے، چنانچہ مئی ۱۹۱۷ء میں (فروری انقلاب کے بعد اور اشتراکی انقلاب اکتوبر سے قبل) ماسکو میں جو پہلی آل روسی مسلم کانگریس ہوئی تھی اس کی اس قرارداد سے کہ ''ساری زمین لوگوں کی ہے'' بشکیری خوش نہ تھے۔ وہ اس پر مصر تھے کہ ''بشکیریا کی ساری زمینیں صرف بشکیریوں کے لیے ہیں'' اسی پر جولائی ۱۹۱۷ء میں پہلی آل بشکیری قومی کانفرنس وجود میں آئی ،جس کا روح رواں ایک فعال سیاست دان احمد زکی ولید وف تھا۔ پوری بشکیری قومیت کی تحریک بہت حد تک اس کی کوششوں کا نتیجہ تھی، اور اگر یہ نہ ہوتا تو تاتاری بشکیری کشمکش اتنی شدت اختیار نہ کرتی اس کے ایما پر اس بشکیری کانفرنس میں قومی علاقائی خودمختاری، بشکیری فوجی یونٹ بنانے اور ۱۹۱۸ء کے بعد وہ تمام زمینیں جو آبادکاروں نے لی ہیں، وہ واپس بشکیریوں کو لوٹانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کانفرنس نے یہ بھی اعلان کیا کہ بشکیری لسانی خصوصیات کی بنا پر دوسرے مسلمانوں سے جو بشکیریا میں آکر آباد ہوئے ہیں، ظاہر ہے اس سے مراد تاتاری تھے، مختلف ہیں، اور یہ مزید اثبات تھا اس امر کا کہ وہ تاتاریوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔

بشکیریا کی خودمختار جمہوریہ

اشتراکی کی انقلاب کے بعد جب ۲۶/اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بشکیریا کے صدر مقام اوفا پر سویت حکومت کا قبضہ ہوگیا، تو بشکیری قوم پرستوں نے اس خیال سے کہ نہ تو انہیں تاتاریوں سے تعاون کرنا پڑے اور نہ بالشویکوں سے، اپنا مرکز اوفا سے اورن برگ منتقل کرلیا۔ اس وقت ان کا سارا زور اس پر تھا کہ بشکیریا کی اپنی ایک خودمختار جمہوریہ بن جائے۔ بالشویکوں اور ان کے مخالفوں کی کشمکش کے ابتدائی دور میں بشکیری قوم پرست تقریباً غیر جانبدار رہے۔ ۱۱/نومبر ۱۹۱۷ء کو ان کی مرکزی کمیٹی کی طرف سے جو پہلا منشور شائع ہوا، اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا۔

> ''ہم نہ بالشویک ہیں، نہ مانشویک، ہم صرف بشکیری ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ ہمیں کس طرف ہونا چاہیے، تو ہم صرف اپنی طرف ہیں۔''

خانہ جنگی کے دوران بالشویک دشمن فوجی قیادت نے بشکیریا کی خودمختاری کی تائید کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر بشکیری قوم پرستوں نے ولیدوف کی زیر قیادت سوویت فوجی کمان سے مصالحت کرلی اور ولیدوف خود اور دوسرے بشکیری کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہوگئے۔ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کے بعد بھی بشکیری قوم پرستوں کے پیش نظر اپنا وہی خودمختار جمہوریہ بشکیریا کا مقصد رہا۔ اس کی وجہ سے ان کی سوویت حکومت کے علاوہ خود تاتاریوں سے بھی برابر ان بن ہوتی رہی۔

ولیدوف اپنے ساتھی کمیونسٹوں سے اثنائے گفتگو میں یہ بات نہیں چھپاتا تھا کہ اس کے پروگرام کا ایک بنیادی نقطہ ایک خودمختار بشکیریا کا قیام ہے جہاں بشکیری ہی حکمراں سیاسی قوت ہوں اور نہ صرف بشکیریا میں روسی آبادکاری کو روکا جائے بلکہ نئے آبادکاروں سے بشکیری زمینیں واپس لے لی جائیں۔ ولیدوف اپنے ہاں مسلمان ترکوں کو آباد کرنا چاہتا تھا تاکہ اس طرح بشکیریا ایک خالص ترکی علاقہ بن جائے اس سے بشکیریوں اور سوویت فوج میں تصادم ہوتا رہتا۔ جب تک کہ خانہ جنگی جاری رہی، اسٹالن بشکیری قوم پرستوں کو ٹالتا رہا، لیکن جیسے ہی سوویت حکومت کو ادھر سے قدرے اطمینان ہوا، اس نے اس معاملے میں دوٹوک فیصلہ کردیا۔

غرض احمد زکی ولیدوف کی یہ ساری کوشش بے کار گئی۔ بشکیری قوم پرستوں کی تنظیم توڑ دی گئی۔ اسی زمانے میں (۱۹۱۷ء۔۱۹۲۲) بشکیریا میں سخت قحط پڑا اس میں کوئی ۲۵ فیصد آبادی ہلاک ہوگئی ہلاک ہونے والوں میں جہاں روسی اور تاتاری آباد کار ۱/۵ اور ۱/۶ تھے، وہاں نیم خانہ بدوش بشکیری ۱/۳ تھے، بشکیریوں کی ان توقعات پر کہ ان کی نسلی حدود کے اندر ان کا صحیح معنوں میں ایک قومی خودمختار علاقہ ہو، آخر میں ۴/جون ۱۹۲۲ء کو سوویت حکومت کے ایک فرمان نے خط تنسیخ کھینچ دیا۔

قازقستان کی علاقائی خودمختاری

قازقستان کا رقبہ دس لاکھ مربع میل سے کچھ زیادہ ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اس کی ایک تہائی آبادی روسی یوکرینی آبادکاروں اور شہر میں رہنے والوں کی تھی، باقی کی دو تہائی آبادی خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قازقوں کی تھی جن میں سے ۵.۱ فیصد شہروں میں رہتے تھے، اور ان میں سے ۵ فیصد سے زیادہ خواندہ نہ تھے۔ ظاہر ہے ایسے علاقوں میں سیاسی سرگرمیاں کیا ہوں گی۔ قازقوں کا سب سے بڑا مسئلہ باہر سے آنے والے آبادکاروں کا تھا۔ بشکیریوں کی طرح قازق بھی تاتاری قیادت سے آزاد رہنے کے خواہاں تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد انہوں نے بھی قازق علاقے کی علاقائی خودمختاری کا اعلان کردیا۔

قازقستان میں روس کی خانہ جنگی کے دوران دونوں فریقوں کے حامی آپس میں لڑتے رہے جہاں تک شہروں کا تعلق تھا، وہاں تو سفید اور سرخ فوجوں کا قبضہ رہا۔ لیکن سطح مرتفع اور دودافتادہ دیہات تک ان میں سے کسی کی پہنچ نہ تھی ۔ آخر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں پہلی قازق سوویت کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا، جس میں ۲۷۷ نمائندوں نے حصہ لیا، جن میں صرف ۲۷۳ کو ووٹ کا حق تھا، اور ان میں سے ۱۹۷ کمیونسٹ تھے۔ اس اسمبلی نے ایک منشور شائع کیا، جس کی رو سے قازقستان کو آزاد سوویت سوشلسٹ جمہوریتوں کی وفاقی یونین میں ایک خودمختار رکن کی حیثیت سے شامل ہونے کا مجاز قرار دیا گیا۔ قازق آئین ساز اسمبلی میں بین الاقوامی صورت حال بھی زیر بحث آئی۔ اسٹالن کے نمائندے نے اپنی طویل تقریر میں کہا کہ قازقوں کو مشرق میں انقلاب کا ہراول ہونا چاہیے۔ ایک خصوصی اپیل میں مشرق کے عوام پر زور دیا گیا کہ وہ سوویت انقلاب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے استعمار پرستوں کی زنجیروں کو اتار پھینکیں۔

جمہوریہ قازقستان کے ابتدائی سالوں میں قازق قوم پرستوں اور قازق کمیونسٹوں میں برابر کشمکش رہی ۔لیکن ۱۹۲۱ء میں جو قحط پڑا، جس سے کہ بیس لاکھ قازق متاثر ہوئے۔ اس نے بشکیریوں کی طرح قازقوں کی بھی کمر ہمت توڑدی۔ ۱۹۲۲ء میں ایک قازق نیشنلسٹ کمیونسٹ نے لکھا:۔ ''مستقبل کے لیے ہمارا طریقہ کار یہ ہونا چاہیے۔ ہم اس وقت قازقستان کی سیادت کے لیے جدوجہد نہیں کررہے ۔ لیکن ہمارا نصب العین اب بھی یہی ہے۔ اگر ہم اس کے لیے لڑتے بھی تو کامیابی ممکن نہ تھی۔ اس لیے ہماری تمام تر کوششیں نوجوانوں کو تعلیم دینے اور ان کو آئندہ کبھی زورآزمائی کے لیے تیار کرنے پر صرف ہونی چاہئیں۔''

وسط ایشیا کے ترکمانوں کی بے حسی

معاصر وسط ایشیا کے دو جرمن مورخوں نے لکھا ہے کہ جہاں ایک طرف انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء میں سوویت کے حامی تاشقند کی مسند اقتدار پر قبضہ کررہے تھے، وہاں دوسری طرف مقامی ترکمان روس کے اور خود اپنے انقلابی المیے کو بڑی بے حسی سے بطور تماشائی دیکھ رہے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ فروری ۱۹۱۷ء سے اکتوبر ۱۹۱۷ء تک بلکہ اس کے بعد کے مہینوں میں بھی جب کہ آنے والے زمانوں کے مقدر کا فیصلہ ہوا تھا، وسط ایشیا کے مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت نے اردگرد ہونے والے سیاسی واقعات سے بہت کم دلچسپی لی۔ اوران کا یہ طرز عملی بہت حد تک نخلستانی زندگی کا لازمہ تھا۔

۱۹۱۷ء میں وسط ایشیا کی کل آبادی کا ۴/۵ حصہ دریائے جیحوں وسیحوں کے دوآبے میں واقع

نخلستانوں میں آباد تھا۔ اور اس آبادی کو متحد کرنے والی صرف اسلام اور اس کے علماء ومساجد کی طاقت تھی لیکن جب تک مذہب پر کوئی زد نہ پڑتی ، اور اسے خطرے میں نہ محسوس کیا جاتا، یہ طاقت بھی عام طور پر خوابیدہ ہی رہتی ۔ پھر دوسری وقت یہ تھی کہ اگر سیاسی اور فوجی معاملات کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوتا، تو علماء اور دین دار مسلمان بالعموم ان کے بارے میں غیر جانبدار رہتے۔

علاوہ ازیں وسط ایشیا کے نیم خانہ بدوش اور پہاڑی قبائل دیہات اور شہروں میں رہنے والوں سے اپنے مزاج، ذہنیت اور فوجی استعداد میں بالکل مختلف تھے۔ خشک میدانوں میں رہنے والے بہت سے ترک اور تاجک قبائل میں ۱۹۱۷ء تک قبائلی قسم کا ہی نظام رائج تھا جس میں کہ سرداروں کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد جب سوویت اقتداران اطراف میں مستحکم ہوا، تو انہی قبائل کی طرف سے اس کے خلاف بغاوت ہوئی۔ جس کا سبب کوئی نظریاتی نزاع نہ تھا۔ بلکہ یہ ان قبائل کی اپنی قدیم قبائل روایات کی حفاظت کے لیے جدوجہد تھی۔ باقی جہاں تک دوسری آبادی کا تعلق تھا وہ سیاسی جمود اور ثقافتی پس ماندگی کی وجہ سے ہر زیردست کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی مدتوں سے عادی ہوچکی تھی، چنانچہ جب زارروس کا اقتدار ختم ہوا، تو اس کی جگہ سوویت اقتدار نے بڑی آسانی سے لے لی۔

۱۹۱۷ء میں وسط ایشیا میں مسلم سیاسی سرگرمیوں کا آغازیوں ہوا کہ حسب معمول مقامی تاتاریوں نے وولگا یورال کے مسلمانوں کی دوسرے لفظوں میں تاتاریوں کی ایک کانفرنس بلائی (۱۳۔۲۰/ اپریل ۱۹۱۷ء) ۱۶/اپریل کے اجلاس میں اس میں بعض وسط ایشیائی دانشور جو اکثر ''جدیدیین'' تھے، اور مارچ میں ''شورائے اسلامی'' کے نام سے ایک جماعت بنا چکے تھے، شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں اس وقت کے خصوصی معمول کے مطابق (مارچ۔اپریل ۱۹۱۷ء) بعض قراردادیں منظور کی گئیں۔ جن میں روسی دستور کو جمہوری اور وفاقی اصولوں پر تشکیل کرنے، مسلمانوں کو مساوی حقوق دینے اور مسلمان علماء کی حالت کو بہتر بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ نیز ایک جمعیت العلماء قائم کی گئی، جس نے فوراً ہی ایک انتہا پسندانہ قدامت پرست مسلک اختیار کرلیا۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں ترکستان مسلم سنٹرل سوویت ترکستان مسلمان مرکزی شورائیہ قائم کی گئی ۔ جس کا بعد میں نام ''ملی مرکز'' رکھا گیا۔ اس میں تاتاری اور مقامی ''جدیدیین'' خاص طور سے نمایاں تھے۔ ''ملی مرکز'' کی پالیسی کافی حد تک اعتدال پسند اور غیر جارحانہ تھی۔

رجعت پسند علماء اور جدیدیین

مئی ۱۹۱۷ء کی پہلی کل روسی مسلم کانگریس کے بعد ''ملی مرکز'' کے جدیدیین ارکان نے خود

مختاری کا سوال اٹھایا۔ وہ صرف داخلی خودمختاری کے حامی تھے۔ روس سے سیاسی طور پر الگ ہونے کے وہ حق میں نہ تھے۔ دراصل ۱۹۱۷ء میں جدیدیین روسی طاقت اور انقلاب سے کہیں زیادہ مسلم علماء کی رجعت پرستی سے خوف زدہ تھے اور ان کا یہ خوف بہت حد تک صحیح تھا۔ اگست ۱۹۱۷ء میں وسط ایشیا کے سب سے زیادہ یورپین اور ترقی یافتہ شہر تاشقند میں جو شہری کونسل کے انتخابات ہوئے، تو ان میں قدامت پسندوں کی غالب اکثریت کامیاب ہوئی۔ رجعت پسند مسلمان علماء نے روسی دائیں بازو والوں سے مل کر ۶۰ فیصد ووٹ لیے۔ ''شورائے اسلام'' کے جدیدیین اور ترک قوم پرستوں کو ۱۰ فیصد اور سوشلسٹ انقلابیوں کو ۲۵ فیصد ووٹ ملے، سوشلسٹ ڈیموکریٹ اور بالشویک دونوں مل کر کونسل کے کل ۱۰۰ نمائندوں میں سے صرف تین نمائندے منتخب کرا سکے (جن میں ازبک صرف ایک تھا) تاشقند کے اس انتخاب کے بعد جدیدیین کو اچھی طرح سے معلوم ہوگیا کہ صوبوں کے انتخابات میں قدامت پسند علماء کا پلہ اور بھی بھاری ہوگا۔ چنانچہ علماء کے بارے میں ان کا رویہ بہت زیادہ محتاط ہوگیا۔

اب جہاں تک علماء اور مذہبی طبقوں کا تعلق تھا، انہیں نہ تو داخلی خودمختاری سے دلچسپی تھی اور نہ مکمل آزادی سے، ان کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وسط ایشیا کی مسلمان آبادی پر ان کا مذہبی اثر ونفوذ بحال رہے۔ انہوں نے روسی دائیں بازو والوں سے محض جدیدیین اور دوسرے بائیں بازو والی پارٹیوں سے مخالفت کی وجہ سے تعاون کیا تھا۔ جنہیں یہ علماء بے دین ملحد کہتے تھے۔ ۱۹۱۷ء کے موسم گرما وخزاں میں اس کشمکش میں بعض مسلمان لبرل اور سوشلسٹ مارے بھی گئے تھے۔ جب ''ملی مرکز'' نے وسط ایشیا کی داخلی خودمختاری کا آئین بنانا شروع کیا تو علماء نے اصرار کیا کہ اس میں ایسی دفعات رکھی جائیں جن میں خودمختاری کے قانون ساز اور عاملہ (ایگزیکیٹیو) اداروں کی نگرانی کی علماء کو ضمانت دی جائے اور انہیں انتظامیہ (ایڈمنسٹریشن) پر بھی کنٹرول ہو۔

ظاہر ہے جیسا کہ انتخابات سے واضح ہو چکا تھا، وسط ایشیا کی آبادی کی غالب اکثریت کے نمائندہ علماء تھے۔ اور ''شورائے اسلام'' کے جدیدیین اور دوسرے مسلمان سوشلسٹ عملاً بے سہارا تھے۔ جب اکتوبر ۱۹۱۷ء میں لینن پیٹرزبرگ میں عنان اقتدار ہاتھ میں لینے میں کامیاب ہوگیا تو تاشقند پر اس کے حامیوں کے ایک گروہ نے قبضہ کرلیا۔ جو روسی خانہ جنگی کے دوران اس تمام عرصے میں ۱۹۱۹ء کے اواخر تک وہاں برسراقتدار رہے۔ انقلاب اکتوبر کے بعد تاشقند کے مسلمانوں نے سوویت طاقت کو مسلمانوں کے خلاف نہیں جانا، بلکہ وہ اسے تمام اقوام کی مساوات کے اصولوں کا علم بردار سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے لبرل گروہ نے وسط ایشیا میں بالشویک اقتدار کا خیر مقدم کیا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ غیر متوقع

بات یہ ہوئی کہ تیسری مسلم وسط ایشیائی کانفرنس منعقدہ ۱۵ر نومبر ۱۹۱۷ء کی قدامت پرست اکثریت نے تاشقند کے ''فاتحین انقلاب اکتوبر'' کے ساتھ تعاون کرنے اور ان سے مل کر مشترکہ حکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ جس میں چھ نمائندے علماء کے ہوں، تین میونسپلٹیوں کے اور تین تاشقند سوویت کے اس کانفرنس پر تمام علماء ہی حاوی تھے۔ اور جدیدیین اور شورائے اسلام والوں کو اس میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن تاشقند کی سوویت کانگرس نے علماء کی یہ پیش کش مسترد کردی اور بالشویکوں اور بائیں سوشلسٹوں کے ایک مختصر سے گروہ نے تاشقند کی حکومت سے مقامی آبادی کو خارج ہی رکھا۔

جب تاشقند کی سوویت حکومت نے علماء کے اس تعاون کو مسترد کردیا تو انہوں نے ایک متحدہ اسلامی جمعیت بنانے کے لیے شورائے اسلام کے لبرلوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس جمعیت کا نام ''اتفاق المسلمین'' تھا۔ نومبر کے اواخر میں فرغانہ کے شہر خجند میں چوتھی مسلم وسط ایشیائی کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں روسی جمہوریہ کے اندر ترکستان کی داخلی خود مختاری کا اعلان کیا گیا۔ خجند کی یہ حکومت تاشقند کے ماتحت نہ تھی۔ اور دونوں حکومتیں بیک وقت اپنے احکام جاری کرتی تھیں۔ وقتی طور پر مصلحتاً ماسکو کی سوویت حکومت نے خجند اور تاشقند کی حکومتوں کے اس جھگڑے میں مداخلت نہیں کی لیکن کچھ عرصہ بعد تاشقند کے فوجی دستے خجند کی طرف بڑھے اور ۱۹ رفروری ۱۹۱۸ء کو خجند پر ان کا قبضہ ہوگیا، اور اس طرح ترکستان کی یہ خودمختار حکومت ختم ہوگئی۔ لیکن خجند کی اس حکومت کے ختم ہوتے ہی ترک قبائل کی مزاحمت شروع ہوگئی، جس نے ''باسمچی'' تحریک کی شکل اختیار کی۔

تاشقند سوویت حکومت کے ہاتھوں خجند کی خودمختار حکومت کے خاتمے کے بعد بظاہر تو وسط ایشیا کی مسلم آبادی اور بالشویکوں میں کسی قسم کے تعاون کا امکان نہیں رہنا چاہیے تھا، لیکن فروری ۱۹۱۸ء کے واقعات (خجند کا سقوط) کے فوراً ہی بعد ازبکوں کی ایک جماعت تاشقند پہنچی اور اس نے سوویت حکام سے تعلقات قائم کرنے پر آمادگی ظاہر کی اسی کی وجہ سے وسط ایشیا میں سوویت اقتدار کو مستحکم ہونے میں بڑی مدد ملی۔ یہ ازبک نوجوان بخاری لبرل تھے، جو امیر بخارا کے خلاف اپنی جدوجہد میں حلیف ڈھونڈنے تاشقند پہنچے تھے۔

بخارا میں اصلاح پسندوں کا قتل

بات یہ ہوئی کہ جب فروری ۱۹۱۷ء مین زار کی حکومت گئی، تو نوجوان بخاری لبرلوں نے اس موقع سے فائدا اٹھاکر امیر بخارا سے کچھ آئینی اصلاحات تسلیم کرالی تھیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں امیر کے سابق رجعت پسند مشیر جلاوطن کردیئے گئے۔ اور نظر یہ آتا تھا کہ اب قرون وسطیٰ کے دور کے اس شہر

میں پارلیمانی اور جمہوری نظام معرض وجود میں آ گیا ہے۔ لیکن اپریل میں پھر رجعت پسند غالب آ گئے۔ اور امیر کے سابق مشیر خواجہ نظام الدین نے جلاوطنی سے واپس آ کر لبرلوں کے خلاف مہم شروع کر دی، انہوں نے بخارا کے عوام کو مشتعل کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور اب آئینی اصلاحات کے بجائے بے دین جدیدیین اور شرع محمدی کے باغیوں کو سخت سزا دینے کے حق میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ اس عوامی سیلاب کے سامنے نوجوان بخاری لبرلوں کے پاؤں ٹھہر نہ سکے، ان کی اکثریت کو گرفتار کر لیا گیا، باقی بھاگ گئے۔ اور بہت سے عوام اور امیر کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے، یا ان کو سخت اذیتیں دی گئیں۔ اگر بخارا میں روسی سفیر بیچ میں نہ پڑتا اور اس کی طرف سے مداخلت کی دھمکی نہ دی جاتی، تو نوجوان بخاری لبرلوں کا بالکل صفایا کر دیا جاتا۔

یہ انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء سے پہلے کے واقعات ہیں۔ اس انقلاب کے بعد نوجوان بخاریوں کا ایک وفد خجند گیا اور وہاں کی مسلم کانگرس سے اعانت چاہی، پھر وہ تاشقند پہنچے، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس وفد کی قیادت فیض اللہ خواجہ، جو بخارا کے ایک دولت مند ترین خاندان میں سے تھا، کر رہا تھا۔ خواجہ فیض اللہ کے اصرار پر مارچ ۱۹۱۸ء میں امیر بخارا کے خلاف ایک فوجی مہم تاشقند سے بھیجی گئی جو بری طرح ناکام ہوئی۔ اس کے بعد بچے کھچے نوجوان بخاری کوئی دو سال تک سمرقند اور تاشقند میں بطور پناہ گزینوں کے رہے۔ اور تاشقند کے بالشویک ان کی مدد کرتے رہے۔ وہ جدیدیین میں شامل ہو گئے جن میں سے ایک مختصر سا مگر مضبوط گروپ سوویت حکومت سے تعاون کا حامی تھا۔ اسی زمانے میں جدیدیین نے کمیونسٹ پارٹی سے بھی روابط پیدا کرنے شروع کر دیئے اور ۱۹۱۹ء۔۱۹۲۰ء میں ماسکو کی مدد سے ان کی پارٹی کے اندر کافی طاقت ہو گئی۔

تاشقند کے بالشویک حکمرانوں کی بعض بے اعتدالیوں کی طرف حکومت ماسکو کی توجہ ہوئی تو ماسکو سے ایک خصوصی کومیسار بھیجا گیا، جس کی زیرہدایت پانچویں وسط ایشیائی سوویتوں کی کانگرس نے ۳۰/اپریل ۱۹۱۸ء کو ''ترکستان خود مختار جمہوریہ'' کے قیام کا اعلان کیا، جو سوویت جمہوریتوں کے وفاق سے ملحق تھی۔ اور اس کے لیے ۳۶ ارکان کی ایک مرکزی کمیٹی چنی گئی، جن میں دس مسلمان تھے اور یہ زیادہ تر جدیدیین تھے لیکن تاشقند کا حکمراں بالشویک گروپ ماسکو کی اجازت سے مزید ایک سال تک مقامی آبادی کو اپنے ساتھ شامل کئے بغیر آزادی سے برسرکار رہا۔

جمہوریہ ترکستان کا قیام

ماسکو کے فرستادہ کومیسار کی زیرنگرانی نئی خود مختار جمہوریہ ترکستان کا نظام کار بنانے کے لیے

۱۷/۲۲رجون ۱۹۱۸ کو جو پہلی علاقائی پارٹی کانگرس ہوئی اس نے ماسکو کے دباؤ کے تحت اور کومیسار مذکور کی رہنمائی میں مقامی مسلم آبادی کا تعاون حاصل کرنے کے سلسلے میں یہ قراردادیں منظور کیں۔

۱۔ پارٹی کی تنظیمات اور سوویت کے نمائندوں سے ملحق مسلم سیکشنوں کا قیام۔

۲۔ روسی زبان کی مساوی سطح پر کاروبار حکومت کے لیے مسلم زبان کا اجرا۔

۳۔ ''مسلم'' زبان میں مطبوعات کی اشاعت۔

۴۔ مقامی حالات سے واقف تجربہ کار کارکنوں کو نظم ونسق میں شامل کیا جائے۔

۵۔ مسلم فوجی دستوں کی بھرتی۔

۶۔ مقامی زبانوں میں کمیونسٹ لٹریچر کی اشاعت۔

خانہ جنگی کے دوران حکومت ماسکو نے تاشقند کے معاملات میں زیادہ مداخلت نہیں کی لیکن فروری ۱۹۱۹ء کے کچھ بعد ماسکو کی طرف سے پھر اسی کومیسار کو بوزیف کو تاشقند بھیجا گیا تاکہ وہ وہاں کی مقامی مسلم آبادی میں کمیونسٹ تحریک کی ترویج کرے۔ اس دفعہ اسے بڑی کامیابی ہوئی، انہی دنوں وسط ایشیائی سوویتوں کی جو ساتویں کانگرس ہوئی اس میں مقامی دانشوروں بالخصوص جدیدیین نے کمیونسٹ پارٹی میں بڑی دلچسپی لی، اس کانگرس میں نصف ڈیلیگیٹ مسلمان تھے۔ تاشقند کا بالشویک حکمران گروپ اب عملاً بے اثر ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد کوبوزیف نے دوسری علاقائی پارٹی کانفرنس سے مسلمان تنظیموں کے علاقائی بیورو کے قیام کی تجویز منظور کرائی۔ اس بیورو میں سابق جدیدی قوم پرست تحریک کے ممتاز رہنما جیسے طرسون خوجہ، ریسکولوف اور نظام الدین خوجہ شامل تھے۔ اس بیورو نے مسلمانوں کو کمیونسٹ پارٹی میں بھرتی کرنے کی مہم شروع کی اس میں اسے بڑی کامیابی ہوئی اور اس طرح وسط ایشیائی علاقائی (ریجنل) کمیونسٹ پارٹی میں مسلمان کمیونسٹوں کا اپنا گروہ منظم ہوگیا۔ اور سابق جدیدی رہنما ایک بااثر طاقت بن گئے۔

۲۴۔۳۰رمئی ۱۹۱۹ء کو وسط ایشیا کے مسلم کمیونسٹوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس دفعہ ازبک کمیونسٹوں کو اپنی سیاسی شکایات پیش کرنے کا صحیح معنوں میں موقع دیا گیا چنانچہ مسلم وفود نے بڑے جوش سے تاشقند سوویت کے کومیساروں پر تنقید کی اور پارٹی سے اپنے بعض مطالبات منوابھی لیے۔ کانفرنس نے مشرق کے عوام سے اپیل کی کہ وہ ''ہندوستان، افغانستان، ایران، چین، بخارا ایشائے کوچک ارمشرقی ایشیا کے پسے ہوئے عوام میں سے ۔۔''ایک ایک، ایک ایک، ایک ایک'' کے اس انقلاب کی تائید کریں۔

ماسکو اور اس کے فرستادہ کو بوزیف کی پیہم کوششوں سے جدیدیین جو حال ہی میں کمیونزم میں شامل ہوئے تھے، بہت بڑی تعداد میں سوویت کی انتظامی مشینری میں داخل ہوگئے۔ تاشقند کی تیسری علاقائی کانگرس منعقدہ یکم جون ۱۹۱۹ء میں وسط ایشیائی سپریم پارٹی آرگن کی گیارہ نشستوں میں چار مسلمانوں کو دی گئیں۔ پانچویں علاقائی پارٹی کانفرنس (وسط جنوری ۱۹۲۰ء) نے مسلمانوں یا زیادہ صحیح الفاظ میں جدیدی گروپ کی پوزیشن وسط ایشیائی پارٹی کی انتظامی مشینری میں اور مضبوط کردی، اور اس دفعہ پارٹی کی علاقائی بیورو میں مسلمانوں کی غالب اکثریت آگئی، اور اس کا سیکرٹری مشہور جدیدی لیڈر طرسون خواجہ مقرر کیا گیا۔

مسلمان کمیونسٹوں اور سوویت کمیونسٹ پارٹی میں اختلاف

اب ان مسلمان کمیونسٹوں اور سوویت کمیونسٹ پارٹی میں اختلاف شروع ہوتے ہیں۔ مصنف کے الفاظ میں: ''تاشقند کا بالشویک آبادکار حکمراں گروہ تو ختم ہوگیا، لیکن ان کی جگہ زیادہ خطرناک جدیدی کمیونسٹوں نے لے لی اور انہوں نے جیسے ہی اقتدار ہاتھ میں آیا اپنے مقاصد کا اظہار کرنا شروع کردیا۔ اسی پانچویں علاقائی پارٹی کانگرس میں، جس میں کہ مسلمانوں کو اس کی بیورو میں اکثریت حاصل ہوئی تھی، نیز مسلم کمیونسٹوں کی تیسری کانفرنس میں جو اسی پارٹی کانگرس کے ساتھ ہی منعقد کی گئی تھی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ خود مختار جمہوریہ ترکستان کا نام سرکاری طور سے خود مختار جمہوریہ ترک ہو۔ ترکستان کی علاقائی کمیونسٹ پارٹی کا نام بدل کر ترک (Turkie) کمیونسٹ پارٹی رکھ دیا۔ مسلمان کمیونسٹ صرف یہیں نہیں رکے، انہوں نے اپنی کمیونسٹ انقلابی تحریک شروع کرنے اور روس کے تمام ترکوں کو ایک ہی علاقائی اور سیاسی وحدت کے تحت متحد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ بظاہر وولگا یورال کے تاتاری سیاست دانوں کے ۱۹۱۷ء کے اقدام کی تقلید کررہے تھے، لیکن اس دفعہ روسی ترکوں کی اس پان ترک تحریک کا مرکز قازان کے بجائے تاشقند تھا''۔

تیسری علاقائی مسلم کانفرنس میں جدیدی کمیونسٹوں کا آخری نصب العین یہ قرار دیا گیا کہ (۱) روس کے تمام ترکوں کو ترک سوویت جمہوریہ یعنی ترکستان جمہوریہ کے طور پر متحد کیا جائے۔ (۲) دوسرے ترکوں کو بھی جو روس کے اندر شامل نہیں ہیں، اس سیاسی وحدت کی طرف لایا جائے، جیسے کہ افغانستان، چین، ایران اور ترکی کے ترک تھے۔ (۳) سوویت جمہوریہ کے وہ ترک جو جغرافیائی اعتبار سے ترکستان سوویت جمہوریہ میں شامل نہیں ہوسکتے، ان کی بڑی علاقائی وحدتیں بنادی جائیں جیسے کہ تاتاری اور بشکیری تھے۔

یہ قرارداد ترک قومی مملکت اور پان ترک سیاسی مقاصد کا ایک حقیقی منشور تھا اور اس کے پیش نظر کمیونسٹ پارٹی کے وسط ایشیا کی سیکشن کو نیشنلسٹ ترک کمیونسٹ پارٹی میں بدلنا اور اس کی قیادت جدیدی کمیونسٹوں کے ہاتھ میں دینا تھا۔ ماسکو کی مرکزی حکومت اس وقت وسط ایشیا کے ان حالات سے بے خبر رہی۔

ازبک جدیدیین اور کمیونسٹ انقلاب

اس میں شک نہیں کہ ازبک جدیدیین، جو اس وقت تاشقند کمیونسٹ پارٹی اور مقامی نظم ونسق کو کنٹرول کررہے تھے، سچے انقلابی تھے۔ جیسا کہ ان کی اپیلوں سے ظاہر ہے، جو انہوں نے مشرق کے عوام سے ''استعمار'' ملاّئیت (Clesicalism)اور جاگیرداری کی زنجیروں کو اتار پھینکنے کے لیے کی تھیں۔ لیکن انقلابی نعروں سے ان کی وابستگی کا منبع ومصدر معاشی وسماجی تبدیلیوں کے جذبے کے بجائے وہ بیس سالہ طویل جدوجہد تھی جو انہوں نے اپنے ہاں ملاّئیت کے خلاف کی تھی۔ نیز وہ نفرت جو انہیں نو آبادیاتی استعماری نظام سے تھی، جدیدیوں کا جویا تو تاجروں یا وسط ایشیا کے عربی مدرسوں کے طالبعلموں میں سے تھے، مسلم یا روسی مزدور طبقوں سے برائے نام ہی تعلق تھا، چنانچہ وہ طبقاتی کشمکش اور پرولتاری آمریت کے نظریات کو چھوٹتے ہی مسترد کردیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ اسماعیل بے گسپرنسکی کے پیروکار تھے، جس نے ۱۹۰۵ء میں کہا تھا کہ چونکہ روسی مسلمانوں کا غالب زرعی معاشرہ طبقات میں بٹا ہوا نہیں ہے، اس لیے اس میں طبقاتی کشمکش کا ظہور نہیں ہوسکتا۔ یہ ازبک جدیین، ترک نیشنلسٹوں اور ترک کمیونسٹوں میں سب سے پہلے تھے جنہوں نے ۱۹۲۰ء میں اس نظریے کو، جسے سب سے پہلے گسپرنسکی نے پیش کیا تھا آگے بڑھایا اور یہی نظریہ ان میں اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں میں سب سے بڑی وجہ نزاع بن گیا۔ جدیدیین کا ترک اتحاد پر یقین اور طبقاتی کشمکش سے انکاران کی تعلیمی پالیسیوں اور پارٹی کے ارکان کی بھرتی کے معاملے میں بھی بہت جلد بروئے کار آگیا وسط ایشیا میں جدیدی کمیونسٹ منتظمین نے جو نئے سکول کھولے، ان میں قومی مسائل کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اور طالب علموں کو مارکسی نظریات کے بجائے ترک قومیت کی تلقین ہوتی تھی۔ ان سکولوں میں پرولتاری اتحاد کے نہیں بلکہ ترکی اتحاد کے بیج بوئے جاتے تھے۔ تاشقند کی اس نئی حکومت کا محکمہ تعلیمات کا کو میسار ازبک نہ تھا۔ بلکہ وہ عثمانی ترکی کے توپ خانے کا ایک فوجی افسر اور سابق جنگی قیدی آفندی تھا۔ نیز ماسکو نہیں بلکہ استنبول اور انقرہ جہاں کمال پاشا فاتح مغربی طاقتوں کے خلاف نبردآزما تھے، ترکستان کمیونسٹ پارٹی کے ان جدیدی ارکان کی ہمدردیوں اور دلچسپیوں کا مرکز بن گئے تھے۔

جدیدی کمیونسٹوں کا تقریروں میں طبقاتی کشمکش اور بین الاقوامی مقاصد کا نہیں بلکہ خود اپنے ملک کے مستقبل کا ذکر ہوتا جیسا کہ ان کے ممتاز نظریاتی ماہر ریسکولوف نے کہا: ترکستان کے لوگوں کے بارے میں جس تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے، یہ اشارہ تاشقند کی دو سالہ سابق بالشویک حکومت کی طرف تھا۔ ترک قوم پرستوں کو اس کا تدارک کرنا ہوگا۔ ترک کمیونسٹ صرف فیکٹری اور ریلوے مزدوروں کے مفاد کے لیے نہیں لڑ رہے۔ (تاشقند میں دوسال تک انہی کا نمائندہ بالشویک جتھا برسراقتدار رہا تھا) بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا یہ بھی فرض سمجھتے ہیں کہ وہ اس ایک ہزار میل وسیع سرزمین میں آباد لوگوں کے ثقافتی اور معاشی مفادات کی حفاظت کے لیے ان سے جا کر ملیں۔ مزید براں ریسکولوف نے قازقوں اور ازبکوں سے پارٹی کی صفوں میں شامل ہونے اور فوج میں بطور رضا کار بھرتی ہونے کی اپیل کی اس طرح وہ اپنے ترک محب الوطنوں کی مدد سے وسط ایشیا میں سوویت انتظامی مشینری اور فوج میں جدیدیین کا اثر ونفوذ مضبوط کرنا چاہتا تھا کہیں ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں سوویت حکومت کے مقرر کردہ ترک کمیشن کو محسوس ہونے لگا کہ تاشقند میں عنان اقتدار ترک قوم پرستوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دوسری سوویت جمہوریتوں میں بھی مسلم کمیونسٹ ابھر رہے تھے اور وہ ترکستان کے جدیدی کمیونسٹوں کی تائید میں تھے۔

قازقستان، وولگا یورال تاتار اور بشکیر میں ترکوں کی داخلی خودمختاری کی جدوجہد سے ترکستان کے جدیدیین کے اور حوصلے بڑھ گئے تھے۔ اس وقت سوویت حکومت کو خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت کے خطرے سے مکمل طور پر نجات نہیں ملی تھی۔ اس لیے لینن اور اسٹالن نے ترکستان اور بشکیری ترکوں کے وفدوں کو کوئی واضح جواب نہ دیا۔ لیکن جب اواخر جون میں پولینڈ کے حملہ آوروں نے یوکرین خالی کر دیا تو ان وفدوں کو بتا دیا گیا کہ ''ترک کمیشن'' میں کسی مسلمان کا تقرر نہیں کیا جائے گا۔ کمیشن مذکور کے نئے ارکان فوراً ہی ازبک کمیونسٹوں کے عزائم سے واقف ہوگئے۔

امیر بخارا کی حکومت کا خاتمہ

اسی دوران میں نئے ''ترک کمیشن'' اور ترکستان میں متعین سرخ فوج نے امیر بخارا کی حکومت کو ختم کر کے ان اطراف میں سوویت اقتدار کو اور مضبوط کر دیا۔ ہوا یوں کہ تاشقند میں جدیدیین کے برسراقتدار آنے سے نوجوان بخاریوں کے بھی حوصلے بڑھے اور انہوں نے بخارا کو زیر کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ ''ترک کمیشن'' اور ازبک کمیونسٹوں کے دباؤ کے تحت انہوں نے بخارا کمیونسٹ پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ اور بعد میں وہ اسی میں مدغم بھی ہوگئے۔ ۲۹/اگست کو سرخ فوج بخارا کی طرف

بڑھی اور دو دن کی سخت جنگ کے بعد بخارا کا شہر ان کے قبضے میں آ گیا۔ امیر بھاگ کر مشرقی بخارا کے پہاڑوں میں چلا گیا، جہاں اس نے اپنے حامیوں کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش کی۔

نوجوان بخارا سرخ فوج کے ساتھ پایۂ تخت بخارا شہر میں داخل ہوئے۔ اور انہوں نے حکومت کی تنظیم نو شروع کردی۔ بخارا میں عوامی جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ جس میں کہ کمیونسٹ یا سوشلسٹ حکومت کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ اکثر نظارتیں (وزارتیں) دو دولت مند تاجر خاندانوں کے ہاتھ میں آئیں۔ جو شروع سے بخارا کی لبرل تحریک کی حمایت کررہے تھے۔ نوجوان بخاریوں نے اپنے اقدامات کی تائید میں قران اور شریعت کے احکام پیش کئے اور آبادی سے یہ وعدہ کرکے کہ ''یورپی سوشلزم کی زیادتیوں کے خلاف پوری قوت سے لڑا جائیگا'' اسے پرسکون رکھا یورپی سوشلزم سے ان کی مراد غیر کمیونسٹ یورپی نوآبادیاتی قوتیں تھیں۔ اسی طرح ان کے تعلیمی پروگرام میں بھی کمیونسٹ کے بجائے قطعی طور پر پان ترکزم کا رجحان تھا۔ مقامی زبان صرف پرائمری سکولوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ سیکنڈری (ثانوی) درجوں میں ''قومی ترکی ادبی'' زبان یعنی عثمانی ترکی کو مروج کیا گیا۔ ان کے پروگرام کے انقلابی نکات وہ وعدے تھے، جو ملائیت کی زیادتیوں کے سد باب، ایشیا سے یورپی صنعت کاروں اور کارخانہ داروں کے صنعتی و تجارتی اثر ونفوذ کو ختم کرنے، نظم ونسق حکومت کو بہتر بنانے اور امیر بخارا اور طبقہ اشراف کی زمینوں کو ضبط کرنے کے سلسلے میں کئے گئے تھے۔ اس ضمن میں نہ تو پرولتاری آمریت کے قیام اور نہ نجی جائدادہی کو ختم کرنے کے بارے میں کچھ کہا گیا۔ غرض نوجوان بخاریوں کے پورے پروگرام کی امتیازی خصوصیت کمیونسٹ عقائد سے کہیں زیادہ ترک قوم پرستانہ نعرے تھے۔

بخارا اور عین انہیں دنوں خیوا میں جو سیاسی نظام بروئے کار لایا گیا، وہ مشتمل تھا اس عہد کی مشرق وسطی کی سوسائٹی کے بوژوائی ڈھانچے اور کمیونسٹ سسٹم کنٹرول پر بہرحال بخارا عوامی جمہوریہ کے قیام سے وقتی طور پر یہ ضرور ہوا کہ وسط ایشیا میں کوئی غیر کمیونسٹ مخالف سیاسی مرکز نہ رہا اور کسی غیر ملکی مداخلت کے لیے بخارا کی امارت جو ایک اڈا بن سکتی تھی، اس کا سدباب ہوگیا۔

فتح بخاراہی کے دنوں میں باکو میں شرقی اقوام کی پہلی کانگرس منعقد ہوئی، جو ایشیا میں بالشویکوں کی انقلابی قوتوں کا سب سے موثر مظاہر تھا۔ اس میں نہ صرف روس کی تمام ترک قومیتوں اور اس کے مشرقی حصوں کے لوگوں کے وفود شریک ہوئے بلکہ ایشیا کے اکثر آزاد اور محکوم ملکوں کے نمائندے بھی آئے۔ یہ کانگرس ''ٹھرڈ انٹرنیشنل'' کے زیر اہتمام ۱-۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو ہوئی اس میں ایک جدیدی کمیونسٹ زبوت بیکوف نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''ہم ترکستان کے انقلابیوں کے نمائندے ان ہزار ہا ہزار سیاہ روملاؤں میں سے کسی ملا سے نہیں ڈرتے ہم نے سب سے پہلے ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ اور آخروقت تک ہم اس جھنڈے کو نیچا نہیں ہونے دیں گے، یا تو ہم اس جدوجہد میں مٹ جائیں گے یا فائزو کامیاب ہوں گے''۔

لیکن موصوف کی اس تنقید سے خود سوویت لیڈر بھی نہ بچے۔ اس ضمن میں اس نے کہا:

''ترکستان کے عوام کو دو محاذوں پر لڑنا ہے ایک تو خود اپنے ہاں ان سیاہ رُو ملاؤں سے ۔اور دوسرے مقامی یورپیوں کے تنگ دلانہ قومی رجحانات کے خلاف، نہ تو کامریڈ زینوف، نہ کامریڈ ٹراٹسکی ہی بلکہ یہاں تک کہ کامریڈ لینن تک بھی ترکستان کی صحیح صورت حال کو نہیں جانتے۔ ہم محض صفحہ کاغذ پر نہیں بلکہ حقیقی زندگی میں حریت، مساوات اور اخوت کے اصولوں کے عملی نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں''۔

عین اس مرحلے پر سوویت حکومت اور کمیونسٹ قیادت نے اس صورت حال پر پوری طرح قابو پانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو وسط ایشیا سے کمیونسٹ دشمن روسی آبادکاروں کا صفایا کیا گیا اس کے بعد ازبک کمیونسٹوں کی جو زیادہ تر جدیدی تھے، باری آئی ان میں سے وہ لوگ جو پرولتاری آمریت اور طبقاتی کشمکش پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس کے بجائے ترکی قوم پرستانہ آئیڈیالوجی کے علمبردار تھے، وہ اپنے عہدوں سے الگ کردیئے گئے۔ اور ''ترک کمیشن'' کی سفارشات پر ماسکو کی طرف سے ایک نئی بیورو کا تقرر عمل میں آیا۔ غرض مصنف کے الفاظ میں:

''تقریباً تین سال کی نسبتاً آزادی کے بعد ترکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی علاقائی تنظیم آخرکار بلا شرکت غیرے ماسکو کے کنٹرول میں آگئی اور بجائے ''ترکی'' ہونے کے ''بین الاقوامی'' بن گئی''۔

لیکن ۱۹۲۰ء میں جدیدیین کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا گیا، جس کا نشانہ بہت سے کمیونسٹ دشمن روسی بنے تھے۔ انہیں صرف قیادت سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہیں ''ازبک مزدوروں'' سے پر کی گئیں۔ اس کے علاوہ دیہات کے بڑے بڑے زمینداروں (بیوں۔بے کی جمع) اور ''لوٹ کھسوٹ کرنے والوں'' کے مقابلے کے لیے دہقانوں یعنی کسانوں کی یونینوں کی تنظیم کی گئی۔

ایک طرف تو ۱۹۲۰ء۔۱۹۲۱ء کے موسم سرما کے دوران ترکستان میں پارٹی مشینری اور نظم و

نسق میں مزید تبدیلیاں کی جاتی رہیں اور دوسری طرف مقامی آبادی کو تعلیمی اور مذہبی زندگی میں متعدد معمولی سی مراعات دی گئیں۔ اتوار کے بجائے ہفتہ وار چھٹی جمعہ کو کردی گئی۔ نظم ونسق حکومت اور پارٹی کے علاوہ ڈاک و تار کے محکموں میں بھی ازبک زبان رائج کی گئی اور بہت سے مقامی لوگوں کو سرکاری ملازمتوں میں لے لیا گیا۔ لیکن علاقائی نظم ونسق کے اہم شعبے بدستور ماسکو کے سخت کنٹرول میں رہے۔

۱۹۲۴ء میں روسی ترکستان اور خیوا و بخارا کی امارتوں کی سابق انتظامی حدود بالکل ہی ختم کر دی گئیں چنانچہ خالص قومیتوں کی بنیادوں پر یہ چار نئی جمہوریتیں بنیں۔ ازبکستان، کرغیزیا، ترکمانستان، اور تاجکستان۔ ان میں سے دو ترکمانستان اور ازبکستان کو تو فوراً ہی یونین جمہوریہ کا درجہ مل گیا۔ اور وہ سوویت یونین کی پوری رکن بن گئیں۔ تاجکستان ۱۹۲۹ء تک ازبکستان کے اندر ایک خودمختار جمہوریہ رہا، اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں اسے بھی یونین جمہوریہ کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ نئی تقسیم جدیدیین کی ان آرزوؤں پر کہ تمام وسط ایشیا کو ایک ترک مملکت کے تحت متحد کیا جائے، ایک ضرب کاری تھی۔ وسط ایشیا کی ترک آبادی کو اب تین قومی وحدتوں میں متفرق کردیا گیا، اور ان میں سے ہر ایک کی مقامی زبان کو قومی زبان کا درجہ دیدیا گیا۔ اس ضمن میں وسط ایشیائے مستقبل کے لیے اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہوئی کہ تاجکستان کو فارسی زبان والی ایک غیر ترک جمہوریہ بنادیا گیا تاکہ وہاں مزید ترکیت کے فروغ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوجائے۔

آذربائیجان کی آزاد ریاست

وولگا سے لے کر سطح مرتفع پامیر تک کے اس ''ترک خطے'' کی مختلف قومیتوں میں جو تاتاریوں بشکیریوں، قازقوں اور وسط ایشیائی ترکوں پر مشتمل تھا، قومی تحریکیں ایک دوسرے سے مربوط رہیں کیونکہ یہ قومیتیں مغرافیائی لحاظ سے باہم متصل تھیں لیکن روس کی وہ ترک قومیں جو اس ''ترک خطے'' سے باہر تھیں، جیسے کہ کریمیا کے تاتاری اور آذربائیجانی، اس انقلابی دور میں ان کی تاریخ بالکل مختلف تھی۔ کریمیا میں اگرچہ تاتاری کل آبادی میں ایک تہائی سے بھی کم تھے لیکن انہوں نے اس جزیرہ نما پر جنوری ۱۹۱۸ء میں سوویت قبضے سے قبل دوبارہ اپنی الگ ریاست بنانے کا عملی مظاہرہ کیا۔ پہلی بار جب جرمن فوجیں کریمیا سے نکلیں تو یہ ریاست ختم ہوگئی، دوسری بار اکتوبر ۱۹۲۱ء میں خود سوویت حکومت نے کریمیا کی تاتاری جمہوریہ کو زندہ کیا اور باوجود اس کے کہ وہاں غیر ترک اکثریت تھی، نظم ونسق اور تعلیم کی اہم زبان تاتاری قرار دی گئی۔

کوہستان کاکیشیا کے ماوراء، آرمینا، جارجیا اور آذربائیجان میں اس عرصہ میں بڑے اہم

سیاسی واقعات رونما ہوئے۔ آذربائیجان میں مسلمانوں کی سب سے موثر سیاسی پارٹی ''مساوات'' تھی جو عثمانی ترکی سے ہمدردی رکھتی تھی۔ سوشل ڈیموکریٹس کے اس گروپ میں جسے اسٹالن نے ۱۹۰۴ میں ''ہمت'' کے نام سے منظم کیا تھا، اور دوسرے مقامی سوشلسٹ گروپوں اور ''مساوات پارٹی'' میں ایک حد تک باہم رواداری پائی جاتی تھی۔ اپریل ۱۹۱۷ء کے آغاز میں قدامت پسند مغربی آذربائیجانیوں کے طبقہ اشراف نے جو آغا لرگروہ (خان، بے، اور سلطان) اور علماء پر مشتمل تھا گنجہ میں اپنی ایک قوم پرست ترکی فیڈرل پارٹی بنائی، یہ ''مساوات'' سے زیادہ اعتدال پسند اور بڑی شدت سے اسلامیت کی علم بردار تھی۔ اس نے آغالرگروہ کی زمینداریوں کو قومی ملکیت میں لینے کی مخالفت کی۔ دیہاتی عوام میں اس پارٹی کا کافی اثر نفوذ ہوگیا اور اس طرح یہ مساوات کی جو زیادہ تر شہروں میں تھی، ایک حریف بن گئی۔ آخر ''مساوات'' کے لیڈر رسول زادنے اس پارٹی سے مفاہمت کرلی۔ چنانچہ دیہات میں تو اس فیڈرل پارٹی کا اثر رہا اور باکو میں ''مساوات'' کا گروپ کام کرتا رہا۔

انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء کے فوراً بعد ماورائے کاکیشیا کی تین قوموں آرمینیوں، جارجیوں اور آذربائیجانیوں نے سوویت حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، ''مساوات'' والوں کا چونکہ پہلے اسٹالن اور ''ہمت'' کے بالشویک گروپ سے تعاون رہ چکا تھا، اس لیے وہ انقلاب اکتوبر کے بعد کافی مہینوں تک سوویت منشوروں کی ان دفعات سے جو قومیتوں کی حق خود ارادی کے متعلق تھیں، متاثر رہے لیکن اس دوران میں باکو میں آرمینیوں اور آذربائیجانیوں میں (۳۱ مارچ ۱۹۱۸ء) تصادم ہوا، جس میں آخر الذکر کو کافی جانی نقصان پہنچا۔ اس کے بعد ''مساوات'' والے کلی طور پر عثمانی ترکی کی طرف دیکھنے لگے۔ اسی زمانے میں عثمانی ترک افواج آذربائیجان میں داخل ہوگئیں۔ ان کا آذربائیجانی مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا۔ اور انہیں باکو سوویت اور آرمینیوں کے خلاف اپنا مخالف سمجھا نیز ''مساوات'' والوں نے بھی خیال کیا کہ آخرکار عثمانی ترکی سے متحد ہوجانے کی توقع پوری ہوہی گئی۔ آذربائیجان کے وزیراعظم خان خوئسکی نے ان الفاظ سے ترک فوجوں کا استقبال کیا تھا:

> ''آذربائیجان نے آخر کار اپنا مقصود پالیا اور ایک صدی سے تمام ترکوں کو سلطان کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا جو نصب العین تھا، اس کی تکمیل ہوگئی اور اب وولگا کے تاتاری، ماورائے کیسپین کے سارٹس، وسط ایشیا کے ازبک، کرغیزی اور خیوا و بخارا کے لوگ بڑی آرزوں سے آزادی دلوانے والی ترک افواج کی آمد کی راہ دیکھ رہے ہیں''۔

اس تقریر کے بعد آذربائیجانیوں اور ترکوں دونوں نے ''زندہ باد افواج ترکیہ اور زندہ باد اتحاد اتراک'' کے نعرے لگائے۔ ۶ ستمبر ۱۹۱۸ء کو رسول زادہ اور آذربائیجانی وفد کے دوسرے ارکان نے بھی استنبول پہنچ کر انہی الفاظ میں اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ سلطان کی مشفقانہ سرپرستی کے تحت آذربائیجان ترقی کرے گا۔

اس وقت ''مساوات'' والوں کو واقعی یہ یقین تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں ترکی جرمنی فتح کے نتیجے میں وہ ترکی کی مدد سے تمام روسی ترکوں کی ایک مملکت یا فیڈریشن بنا سکیں گے۔ باکو پر قابض ہونے کے بعد ترکی فوجیں داغستان کی طرف بڑھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ارادہ روس کے دوسرے مسلمان علاقوں کو بھی اپنے زیر اثر لانے کا تھا۔ لیکن جیسے ہی جرمن، اسٹریا اور ترکی پر برطانیہ، فرانس اور ان کے اتحادیوں کو فتح ہوئی، مشرق قریب کی تمام صورت حال بدل گئی، روس میں ترکی افواج کی پیش قدمی رک گئی۔ اور برطانیہ کے مطالبے پر ۱۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو ترکی افواج نے صرف دو ماہ کے قبضے کے بعد باکو اور دوسرے ماورائے کاکیشیا کے علاقے خالی کر دیئے اور برطانوی فوجیں وہاں داخل ہو گئیں۔

خارجی اور داخلی مشکلات میں برابر گھرے رہنے کی وجہ سے آذربائیجان میں ''مساوات پارٹی'' کی حکومت کوئی خاص قابل ذکر اصلاحات نافذ نہ کر سکی۔ اس نے ایک دو بار زرعی اصلاحات نافذ کرنی چاہیں، لیکن پارٹی کا دائیں بازو سابق فیڈرل گروپ اس میں آڑے آیا، اور پھر چونکہ باکو کے تیل کی برآمد میں مشکلات پیدا ہو گئی تھیں اس لیے ملک اقتصادی بحران کی لپیٹ میں آ گیا جس کی وجہ سے ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ صرف ایک میدان میں آذربائیجان کی یہ چند روزہ حکومت کچھ کر پائی اور وہ اس کا تعلیمی نظام کو ترکیت کے قالب میں ڈھالنا تھا۔ غرض تمام سرکاری سکولوں میں روسی زبان کی جگہ آذربائیجانی یا عثمانی ترکی رائج کر دی گئی، کئی نئے ثانوی سکولوں اور ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور قومی صحافت کو بھی بڑا فروغ ہوا۔

ترکی افواج کے انخلاء (موسم سرما ۱۹۱۸ء۔۱۹۱۹ء) کے بعد ''مساوات'' کے متعلق برطانوی خدشات کو دور کرنے کے لیے ایک آذربائیجانی پارلیمنٹ بھی منتخب کی گئی، جو زیادہ موثر نہ تھی۔ کیونکہ اقتدار تمام تر ''مساوات'' کے سیاست دانوں، تیل کے تاجروں اور صنعت کاروں اور گنجہ کے زمینداروں کے ہاتھ میں رہا۔ پارلیمنٹ کے ایک سو ارکان میں سے مساوات نے ۳۸، خان کوئسکی کے گروپ نیشنل ڈیموکریٹس نے حکومت کے حلیف مسلم سوشلسٹوں نے ۱۲ اور شمالی مغربی آذربائیجان کے ایک ترقی پسند (پروگریسو) ''سنی گروپ احرار'' نے ۷ نشستیں حاصل کیں۔ ''مساوات'' کے سخت ترین مخالف انتہائی

دائیں بازو کے ''اتحادیوں'' کو جو قدامت پسند علماء پر مشتمل تھے ۱۳ نشستیں ملیں۔ باقی اقلیتوں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے نمائندے تھے۔

آذربائیجان کی آزاد ریاست کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کی سب سے بڑی حکمران پارٹی ''مساوات'' ایک ہم آہنگ سیاسی تنظیم نہ تھی۔ اسکے بائیں بازو کی قیادت رسول زادہ وغیرہ باکو کے دانش وروں کی تھی جو لبرل ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی انتہاپسندی کی طرف بھی چلے جاتے تھے اس کا دائیں بازو طبقہ اشراف کا تھا، او ان دونوں میں برابر نزع رہا۔ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں رسول زادہ کی کوششوں سے سوویت یونین سے روابط قائم کئے گئے۔ آذربائیجان میں کمیونسٹ پارٹی کی قانوں حیثیت تسلیم کرلی گئی اور مقامی کمیونسٹوں کے بارے میں زیادہ رواداری کی پالیسی کا نفاذ کیا گیا۔

اس ضمن میں غیر متوقع بات یہ ہوئی کہ سوویت حکومت سے مصالحت کی اس نئی پالیسی کی تائید نہ صرف ''مساوات'' کے بائیں بازو اور مسلم سوشلسٹوں نے کی، بلکہ انتہاپسند دائیں بازووالے ''اتحادی'' بھی اس کے حق میں تھے۔ یہ گروہ ''مساوات'' سے کم قوم پرست تھا۔ اور اپنی پارٹی کے پروگرام کی بنیاد اسلام کے مذہبی اصولوں پر رکھتا تھا۔ اتحادیوں پر شیعہ علماء کا غالب اثر تھا۔ ایک تو شیعیوں اور سنیوں کی روایتی مخالفت، دوسرے شیعہ علماء کا ایران کی مذہبی زندگی اور اس کی ثقافت سے جو تعلق تھا اس کی وجہ سے ''اتحادی'' ترکیت کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک پان ترکزم کے حامیوں کی قوم پرستی جو مذہبی اصولوں کے مقابلے میں لسانی اور نسلی اتحاد کو مقدم سمجھتے تھے، تعلیمات نبوی ﷺ کے مخالف تھی۔ ان کا کہنا تھا: ''اسلام ہمیشہ سے ایک عالمگیر مذہب رہا ہے۔ اور اس کا قومی تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اتحاد پارٹی کے ارکان کو صرف اتحاد اسلامی کے نقطہ نظر سے سوچنا چاہیے۔ ہمارے پارٹی کی ساخت ہی جس میں نہ صرف آذربائیجانی ترک ہیں بلکہ ایرانی اور کاکیشیا کے پہاڑی باشندے بھی شامل ہیں۔ پیغمبر اسلام کی تلقین کردہ بین الاقوامیت کی عالمگیریت کا ایک واضح ثبوت ہے۔''

غرض سنی ترک قوم پرستوں کی مخالفت میں اتحادیوں نے رضا کارانہ طور پر کمیونزم کے بین الاقوامی عقیدے اور اس کے پروپیگنڈے کی حمایت کی۔ بالشویکوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ''مساوات پارٹی'' کے خلاف اتحادیوں کی اس جدوجہد کی بڑی ہوشیاری سے مدد کی اور اس طرح مافوق قومیت اتحاد کے اصول کے تحت وقتی طور پر انتہائی دائیں بازو اور انتہائی بائیں بازو والے اکھٹے ہوگئے۔ ماورائے کاکیشیا سے برطانوی افواج کے انخلاء اور سفید روسی جرنیل کی شکست کے بعد (مارچ ۱۹۲۰ء) پہلی دفعہ دوسال کے عرصے میں آذربائیجان کی آزاد ریاست سرخ فوج کی زد میں آئی۔ آرمنی کمیونسٹ

لیڈر انستاس میکویان کو فروری ۱۹۱۸ء میں آذربائیجان بالشویک پارٹی کا تنظیمی قائد بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے باکو میں ایک الگ آذربائیجانی کمیونسٹ پارٹی بنائی، جس نے یہاں وہی کام کیا جو وولگا یورال اور اس روس کے دوسرے ترک علاقوں میں ترک قوم پرست کمیونسٹوں نے کیا تھا۔ باکو کی اس نئی کمیونسٹ پارٹی نے ترک آبادی میں ''مساوات'' پارٹی کے اثر ونفوذ کو ختم کرنے پر اپنی تمام کوششیں مرکوز کردیں۔ اس زمانے میں اناطولیہ میں مصطفےٰ کمال نے ترکوں کی قیادت سنبھالی، اس سے میکویان کا کام اور بھی آسان ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ مصطفےٰ کمال اس میں رکاوٹ نہ بنا، بلکہ اس نے آذربائیجان، آرمینیا اور جارجیا کے ماسکو کے کنٹرول میں جانے میں مدد دی۔ دراصل اس وقت کمالی ترک یونان سے برسر جنگ تھے اور فاتح اتحادیوں (برطانیہ وغیرہ) اور آرمینیوں سے ان کی چل رہی تھی۔ قدرتاً ان کی نگاہیں مدد کے لیے ماسکو کی طرف اٹھیں۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال کو ادھر سے گولہ بارود اور اسلحہ مل گئے۔ سوویت حکومت نے سوچا ہوگا کہ وسط ایشیا کے جدیدیتین اور قازان کے مسلم سوشلسٹوں کی طرح مصطفےٰ کمال بھی مشرق میں ان کے انقلابی کام کے لیے آلہ کار بن جائے گا۔

اکیلا آذربائیجان سوویت کمیونسٹوں اور کمالی ترکوں کے متحدہ دباؤ کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ پھر خود آذربائیجانی حکومت میں بھی اختلافات تھے۔ خان خوئسکی اور قدامت پسند بورژوا گروپ نے رسول زادہ کی طرف سے پیش کردہ کمیونسٹوں اور سوویت حکومت سے پرامن تعاون کی پالیسی کو مسترد کردیا۔ پندرہ ہزار سرخ فوج آذربائیجان کی سرحد پر داغستان میں تیار کھڑی تھی، ادھر میکویان کے کمیونسٹ خفیہ اڈے برابر طاقتور ہورہے تھے۔ اور ان کے پاس آدمیوں اور ہتھیاروں کی کمی نہ تھی۔ لیکن سوویت حکومت کی اتنے وسیع پیمانے پر یہ تیاریاں بے کار تھیں، کیونکہ ''مساوات'' کی آذربائیجانی حکومت سوویت کے اندازے سے کہیں زیادہ کمزور تھی۔ ۲۷ راپریل ۱۹۲۰ء کو اسے سوویت حکومت اور باکو کمیونسٹوں کے نام پر بارہ گھنٹے کے اندر اندر اقتدار حوالے کردینے کا الٹی میٹم دیا گیا، چنانچہ آذربائیجان پارلیمنٹ کا آخری اجلاس بلایا گیا کمیونسٹ دستے پارلیمنٹ کی عمارت کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ غرض بغیر کسی مخالفت کے الٹی میٹم منظور کرلیا گیا۔ اور بالشویکوں کو اقتدار حوالے کرنے کا فیصلہ ہوگیا۔ دوسرے دن باکو کے کمیونسٹوں نے نئی حکومت کی تشکیل کی۔ اس میں آٹھ آذربائیجانی مسلمان (سات ہمت گروپ کے کمیونسٹ اور ایک شیعہ ایرانی کمیونسٹ تنظیم ''عدالت'' کا) اور تین روسی کمیونسٹ تھے۔ مساوات پارٹی کے بورژوائی اور طبقہ اشراف کے دائیں بازو کے بہت سے لیڈر گرفتار کرلیے گئے۔ رسول زادہ نے اسٹالن کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی شخصی دعوت کو مسترد کردیا۔ اور ۱۹۲۱ء میں وہ روس سے باہر فرار

ہوگیا۔ بہت سے بائیں بازو کے ''مساوات'' پارٹی کے ممبر کمیونسٹ صفوں میں شامل ہوگئے۔ اوائل ۱۹۲۰ء میں آذربائیجان میں وہی سوویت حکومت کے دست وبازو تھے۔ لیکن بعد کے سالوں میں ان سے اکثر تطہیر کا نشانہ بنے۔ دو سال بعد مارچ ۱۹۲۲ء میں آذربائیجان کی آزاد قانونی حیثیت ختم کردی گئی اور وہ بھی سوویت یونین کی دوسری جمہوریتوں کی طرح سوویت نظام کے تحت ایک جمہوریت بن گیا۔

کتاب کے آخری باب کا عنوان ''نتیجہ'' ہے۔ اس میں مصنف لکھتا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں روس کی خانہ جنگی کے ختم اور سوویت اقتدار کے مستحکم ہوجانے سے روسی ترکوں کی تاریخ کی ایک اہم داستان کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ سوویت حکومت نے ان ترکوں کی مختلف خود مختار جمہوریتیں بنادیں جن میں وہاں کے باشندوں کی زبانوں کو سرکاری زبانوں کا درجہ دے دیا گیا۔ اور بظاہر سمجھ لیا کہ اس طرح روسی ترکوں کی قومی امنگوں کی جن کے لیے ترک قوم پرستوں کی ایک پوری نسل جدو جہد کرتی رہی تھی تسکین ہوگئی ہے لیکن عملاً یہ جمہوریتیں سوویت حکومت اور کمیونسٹ پارٹی کے کنٹرول میں تھیں۔ غرض ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک سیاسی اظہار رائے اور نئی نسلوں میں ترک قومیت کی روح پیدا کرنے کی ایک حد تک جو آزادی تھی۔ اس کا دور ختم ہوگیا۔ اور سوویت یونین کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ساتھ روسی ترکوں کی زندگی اور ان کے ذہنوں پر ایک ہمہ گیر وہمہ جہتی آمرانہ نظام مسلط کردیا گیا۔

۱۹۲۰ء کے بعد روسی ترکوں کی ثقافت اور زندگی پر اسلامی اثرات میں بہت زیادہ کمی آگئی اور اس کے مقابلے میں سیکولرزم کا اثر بہت بڑھ گیا۔ اسی زمانے میں مصطفےٰ کمال پاشا برسر اقتدار آئے اور وہاں بھی سیکولرزم کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد روس کے ان سکولوں میں جہاں روسی ترکوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اسلام کی تعلیم بند کردی گئی۔ مساجد کے میناروں سے موذنوں کے لیے اذان دینے کی اجازت نہ رہی۔ مساجد جزوی طور پر بند ہوگئیں اور تھوڑے بہت جو دینی مدارس رہ گئے تھے، ان میں طالب علموں کے لیے تعلیم حاصل کرنے پر پابندیاں لگ گئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پہلے ۱۹۲۵ء۔۱۹۲۷ء میں روسی ترکوں کا رسم الخط عربی سے لاطینی میں اور پھر ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۹ء میں روسی میں بدل دیا گیا اور اسی طرح روس کے ترک باشندے تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے باقی اسلامی دنیا سے منقطع ہوکر رہ گئے۔

مصنف نے کتاب کے آخری باب میں روس میں پان ترکزم اور اسلام کی اس تمام جدوجہد پر محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روسی ترکوں میں دراصل بیداری کی تحریک کا آغاز ''پان اسلامزم'' سے ہوا تھا جس کے نظری قائد سید جمال الدین افغانی تھے۔ یہی وہ تحریک تھی جس نے روس میں آباد تمام

ترک باشندوں میں وحدت کا احساس پیدا کیا، اور ان میں سیاسی شعور کی روح پھونکی اس کے بعد ان کے ہاں ترکیت و اسلامیت سے ملی جلی ترک قومیت کی نشوونما ہوئی، جس نے آگے چل کر پان ترکزم کی شکل اختیار کرلی۔ مصنف لکھتا ہے کہ یہ ''پان ترکزم'' کا جذبہ تمام تر سطحی تھا، اور اس کی جڑیں نہ تو ترکوں کی تاریخ میں تھیں اور نہ ان کے قومی و ثقافتی شعور میں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے نہ تو روسی ترکوں میں قومی اتحاد پیدا ہوسکا اور نہ وہ مل کر اور ایک ہوکر کوئی مثبت سیاسی اقدام کرسکے۔ بلکہ روس کے مختلف علاقوں میں آباد ہونے کی وجہ سے نہ ان کی زبان ایک رہ سکی اور نہ اپنی جغرافیائی وحدت قائم رکھ سکے۔ اور اکثر اوقات ان میں آپس میں تفرقات پیدا ہوتے رہے۔ وولگا یورال کے نسبتاً ترقی یافتہ تاتاریوں سے کم ترقی یافتہ بشکیری، ترکمانی اور قازقی اکثر بدظن رہتے تھے۔

روسی ترکوں کی قومیت کی جدوجہد کا تو یہ انجام ہوا۔ ان میں اسلام کی جو تحریک اٹھی تھی، وہ اس لیے زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی کہ اول تو ترک قدامت پرستوں اور جدیدیین میں شروع ہی سے اختلاف پیدا ہوگیا، جس نے اکثر اوقات منافرت کی شکل اختیار کی۔ اور بارہا ایسا ہوا کہ جدیدیین کو قدامت پرستوں کی زیادتیوں سے بچنے کے لیے بالشویکوں کی پناہ اور مدد لینی پڑی، اسی طرح کہیں کہیں قدامت پرستوں نے قوم پرست جدیدیین کے مقابلے میں بین الاقوامیت کے حامی بالشویکوں کو ترجیح دی اور ان سے سیاسی گٹھ جوڑ کرلیا۔ ابتداہی سے ترک جدیدیین کا رجحان ایک حد تک سیکولرزم کی طرف تھا۔ شروع میں تو ان کا سیکولرزم زیادہ نمایاں نہ تھا، بلکہ وہ اسلامیت ہی کی بظاہر ایک شکل بتائی جاتی تھی، لیکن آہستہ آہستہ سیکولرزم کا زور بڑھتا گیا۔ اور اس نے پہلے محدود ترک قومیت اور بعد میں پان تاتارزم کی شکل اختیار کرلی، جس سے ترکوں کے ہاں جو اسلامی تحریک تھی اس کو بڑا نقصان پہنچا۔

مصنف لکھتا ہے کہ ۱۹۰۵ء سے روسی ترکوں میں اسلامی وقومی بیداری کی جو لہر اٹھی تھی، ۱۹۱۷ء میں وہ ایک اہم ارتقائی، مرحلے پر پہنچ گئی تھی۔ افسوس ہے کہ کمیونسٹ انقلاب اور اس کے بعد کی خانہ جنگی کے دوران روسی ترک بحیثیت مجموعی کوئی مثبت اقدام نہ کرسکے۔ اور ان کے علاقے ایک ایک کرکے بالشویک تسلط میں آگئے۔ اور اس طرح ان کی قومی تحریک جواب اس منزل میں داخل ہورہی تھی جہاں اس کے بارآور ہونے کی توقع کی جاتی، ناتمام رہ گئی اور ترک قومیت اور ترک ذہن ایک اور قالب میں ڈھلنے پر مجبور کردیا گیا۔

اب جہاں تک روایتی اسلامی ثقافت کا تعلق ہے، روسی ترکوں میں اس کے اثرات بتدریج کم ہوتے جارہے ہیں اور وہ بالکل سیکولرزم میں رنگے گئے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کی ترکی

قومیت بھی اسی طرح ناپید ہوجائیگی اور وہ سلاوی روسیوں میں مدغم ہوکر رہ جائینگے۔ ان میں اب تک اپنے ترک ہونے کا احساس ہے اور پھر ان کی قومی و علاقائی زبانیں بھی زندہ ہیں، اور ظاہر ہے روبہ ترقی بھی ہیں۔ مصنف کے نزدیک روسی ترکوں کے مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے لیکن یہ کہ وہ آگے چل کر اپنی انفرادیت بالکل کھودیں، یہ ممکن نظر نہیں آتا۔